الرسالہ

سرپرست
مولانا وحیدالدین خاں

حسد اور گھمنڈ جب کسی آدمی کے اندر داخل ہوتے ہیں
تو وہ عقل کو باہر کر دیتے ہیں ———

فروری ۱۹۸۳ □ قیمت فی پرچہ — تین روپے □ شمارہ ۷۵

الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خاں

حسد اور گھمنڈ جب کسی آدمی کے اندر داخل ہوتے ہیں
تو وہ عقل کو باہر کر دیتے ہیں ————

فروری ۱۹۸۳ □ قیمت فی پرچہ — تین روپے □ شمارہ ۷۵

اسلامی مرکز کا ترجمان

الرسالہ

فروری ۱۹۸۳
شمارہ ۷۵

جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دھلی ۱۱۰۰۰۶ (انڈیا)

تعارفی سٹ

اسلام کے تعارف پر ہم نے پانچ کتابوں کا ایک سٹ تیار کیا ہے جو مدارس میں ابتدائی اسلامی تعلیم کے لئے بھی مفید ہے اور اسلام کے عمومی تعارف کے لئے بھی۔ یہ سٹ حسب ذیل ہے۔

۱۔ سچا راستہ	ایک روپیہ پچاس پیسے
۲۔ دینی تعلیم	تین روپیہ
۳۔ حیات طیبہ	دو روپیہ پچاس پیسے
۴۔ باغ جنت	تین روپیہ
۵۔ نار جہنم	تین روپیہ

اس تعارفی سٹ کو اردو کے علاوہ دوسری زبانوں میں شائع کرنے کے لئے جو لوگ کوئی تعاون کریں وہ انشاء اللہ خدا کے یہاں اس کا اجر پائیں گے۔

مکتبہ الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۶

زر تعاون سالانہ ۳۶ روپیہ • خصوصی تعاون سالانہ دو سو روپے • بیرونی ممالک سے ۲۰ ڈالر امریکی

فرمایا، جس چیز کا پینا حرام ہے اس کا بیچنا بھی حرام ہے
اس کے بعد اس نے حکم دیا اور اس کی شراب بطحاء میں
بہادی گئی

مومن کے اندر بھی وہی جذبات ہوتے ہیں جو دوسرے انسانوں میں ہوتے ہیں۔ کبھی خواہش کے زیر اثر وہ لفظی تاویل کرتا ہے، کبھی اس کے اوپر مال کی محبت غالب آجاتی ہے۔ مگر یہ سب اس وقت تک ہے جب تک خدا کا حکم اس کے سامنے نہ آئے۔ خدا کا واضح حکم سامنے آتے ہی وہ اس کے آگے جھک جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ لفظی تاویلوں کو بھی بھول جاتا ہے اور اسی کے ساتھ مال یا کسی دوسری چیز کی محبت کو بھی۔

موجودہ دنیا میں آدمی کا امتحان یہ نہیں ہے کہ وہ فرشتہ ہونے کا ثبوت دے۔ یعنی کبھی کوئی غلطی نہ کرے اور نہ کبھی کوئی برا خیال اس کے دل میں آئے۔ اس قسم کی پارسائی فرشتوں سے مطلوب ہے نہ کہ انسان سے۔ انسان سے اس کے رب کو جو چیز مطلوب ہے وہ یہ کہ وہ تنبیہ کے بعد غلطی پر اصرار نہ کرے۔

انسان کو جن جذبات کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے اور جس قسم کی دنیا میں اس کو رکھا گیا ہے، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کے دل میں غلط خیالات آئیں گے۔ وہ غلط باتیں سوچے گا اور عملاً بھی غلط کام کر گزرے گا۔ مگر اس قسم کی کسی غلطی کو وقتی غلطی ہونا چاہیے نہ کہ مستقل۔ جب بھی آدمی کا ضمیر ٹوکے یا کوئی خارجی آواز اس کی غلطی پر اس کو متنبہ کرے تو اس وقت اس کو ضد اور ہٹ دھرمی کے بجائے سیدھے طریقہ پر اپنی غلطی کا اعتراف کر لینا چاہیے اور فوراً اپنی اصلاح کی کوشش میں لگ جانا چاہیے۔

انسان کا کمال غلطی کر کے دوبارہ پلٹ آنے میں ہے نہ کہ سرے سے غلطی نہ کرنے میں۔ غلطی ہو جانا جرم نہیں ہے۔ بلکہ غلطی پر قائم رہنا جرم ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ جنت ان متقیوں کے لئے ہے جن کا حال یہ ہو کہ جب وہ کوئی برائی کر بیٹھیں یا اپنی جان پر کوئی ظلم کر ڈالیں تو وہ اللہ کو یاد کر کے اپنے گناہوں کی معافی مانگیں۔ اللہ کے سوا کون ہے جو گناہوں کو معاف کرے اور وہ جانتے ہوئے اپنے کئے پر اصرار نہیں کرتے (آل عمران ۱۳۵)

کیسا عجیب

گاندھی جی کی مشہور شاگرد میرا بہن ایک انگریز خاتون تھیں، جن کا اصل خاندانی نام میڈلین سلیڈ (Madeleine Slade) تھا۔ وہ سر ایڈمنڈ سلیڈ کی لڑکی تھیں۔ ان کو اپنے لئے ایک "زندہ خدا" کی تلاش تھی۔ ابتداءً انھوں نے مشہور موسیقار بیتھوون میں اپنی اس تلاش کا جواب پایا۔ تاہم ان کی فطرت اس پر پوری طرح مطمئن نہ تھی۔ اس کے بعد ان کی ملاقات مشہور فرانسیسی مفکر رولینڈ رولاں سے ہوئی۔ رولینڈ رولاں گاندھی جی سے بہت متاثر تھا، اس نے مس سلیڈ سے کہا، "کیا تم نے گاندھی جی کے بارے میں نہیں سنا؟" مس سلیڈ نے کہا۔ "نہیں" رولینڈ رولاں نے کہا "وہ دوسرے مسیح ہیں۔"

He is another Christ

اس کے بعد مس سلیڈ نے مہاتما گاندھی کا مطالعہ شروع کیا اور ان کی اتنی گرویدہ ہوئیں کہ اپنا وطن چھوڑ کر مستقل طور پر ہندستان آنے کے لئے تیار ہو گئیں۔

یہ ۱۹۲۴ کا واقعہ ہے۔ مس سلیڈ نے سمندری جہاز پر اپنے لئے ایک برتھ رزرو کی تاکہ وہ جلد سے جلد ہندستان پہنچ سکیں۔ اس کے بعد اچانک انھیں خیال آیا کہ میں گاندھی جی کے ملک میں جارہی ہوں مگر میں گاندھی جی کے ملک کی زبان نہیں جانتی۔ انھوں نے ہندستان کی زبان کے بارے میں معلومات کیں تو انھیں بتایا گیا کہ ہندستان کی عام زبان اردو ہے۔ چنانچہ انھوں نے اردو زبان سیکھنے کے لئے اپنے سفر ہند کو ایک سال کے لئے ملتوی کر دیا۔ وہ اس سے پہلے انگریزی، فرانسیسی اور جرمن زبانیں جانتی تھیں، انھوں نے دوبارہ محنت کر کے اردو سیکھی اور پھر ۱۹۲۵ میں ہندستان آئیں۔

گیٹا سرینی (Gitta Sereny) نے میرا بہن (سابق مس میڈلین سلیڈ) کے حالات لکھے ہیں (ٹائمس آف انڈیا ۵ دسمبر ۱۹۸۲) انھوں نے مذکورہ واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

In the fall of 1924, four months into her training included learning Urdu and converting to vegetarianism.

۱۹۲۴ کی موسم خزاں کے چار مہینے مس سلیڈ کے لئے تربیتی مہینے تھے، ان میں اس نے اردو زبان سیکھی اور اپنے آپ کو سبزی خوری کا عادی بنایا ——— پچاس سال پہلے ملک کی عام زبان اردو تھی۔ یہ دین کی عمومی اشاعت کا بہت بڑا موقع تھا۔ مگر اس کو مسلمانوں نے لایعنی سیاست کے لئے استعمال کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خدا نے یہ موقع ان سے چھین لیا۔ اب اردو کے ذریعہ یہاں نہ سیاست کا کام کیا جا سکتا ہے اور نہ اشاعت دین کا۔

حقیقت کی تلاش

مولانا وحید الدّین خاں

مکتبہ الرسالہ
جمعیّۃ بلڈنگ □ قاسم جان اسٹریٹ □ دہلی ۶

مطبوعات اسلامی مرکز

سال اشاعت ۱۹۸۳

قیمت تین روپئے

ناشر مکتبہ الرسالہ
جمعیتہ بلڈنگ
قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۶

طابع جے۔ کے۔ آفسٹ پرنٹرز دہلی ۶

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کی اسٹوڈنٹس یونین کی طرف سے ستمبر ۱۹۵۸ میں اسلامی تقریروں کا ایک ہفتہ منایا گیا جس میں مختلف علماء اور مفکرین نے اسلام کے مختلف پہلوؤں پر تقریریں کیں۔ اس سلسلہ کا عنوان تھا ________ سلسلۂ تقاریر اسلام:

Series of lectures on Islam

اس موقع پر راقم الحروف نے ۶ ستمبر ۱۹۵۸ کو یونیورسٹی کے یونین ہال میں ایک تقریر کی۔ یہ تقریر بعد کو اردو میں "حقیقت کی تلاش" اور عربی میں "الفحص عن الحق" کے نام سے شائع ہوئی۔ زیر نظر کتاب اسی تقریر کا نظر ثانی کیا ہوا ایڈیشن ہے۔

مکتبہ الرسالہ کی طرف سے جو کتابیں شائع ہوئی ہیں، ان میں سے کچھ علمی اسلوب میں ہیں اور کچھ سادہ اسلوب میں۔ زیر نظر کتاب سادہ اسلوب والی کتابوں کی فہرست میں ایک اضافہ ہے۔ اس کو اسلام کے عمومی تعارف کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے۔

وحید الدین

۵ دسمبر ۱۹۸۲ء

حقیقت کی تلاش

کائنات ایک بہت بڑی کتاب کی مانند ہمارے سامنے پھیلی ہوئی ہے مگر یہ ایک ایسی انوکھی کتاب ہے جس کے کسی صفحے پر اس کا موضوع اور اس کے مصنف کا نام تحریر نہیں، اگرچہ اس کتاب کا ایک ایک حرف بول رہا ہے کہ اس کا موضوع کیا ہو سکتا ہے اور اس کا مصنف کون ہے۔

جب کوئی شخص آنکھ کھولتا ہے اور دیکھتا ہے کہ وہ ایک وسیع و عریض کائنات کے درمیان کھڑا ہے تو بالکل قدرتی طور پر اس کے ذہن میں یہ سوال آتا ہے کہ ——— "میں کیا ہوں اور یہ کائنات کیا ہے"، وہ اپنے آپ کو اور کائنات کو سمجھنے کے لئے بے چین ہوتا ہے۔ اپنی فطرت میں سموئے ہوئے اشارات کو پڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔ دنیا میں وہ جن حالات سے دوچار ہو رہا ہے، چاہتا ہے کہ ان کے حقیقی اسباب معلوم کرے۔ غرض اس کے ذہن میں بہت سے سوالات اٹھتے ہیں جن کا جواب معلوم کرنے کے لئے وہ بے قرار ہوتا ہے مگر وہ نہیں جانتا کہ ان کا جواب کیا ہے۔

یہ سوالات محض فلسفیانہ قسم کے سوالات نہیں ہیں بلکہ یہ انسان کی فطرت اور اس کے حالات کا قدرتی نتیجہ ہیں۔ یہ ایسے سوالات ہیں جن سے دنیا میں تقریباً ہر شخص کو ایک بار گزرنا ہوتا ہے۔ جن کا جواب نہ پانے کی صورت میں کوئی پاگل ہو جاتا ہے، کوئی خودکشی کر لیتا ہے، کسی کی ساری زندگی بے چینیوں میں گذر جاتی ہے، اور کوئی اپنے حقیقی سوال کا جواب نہ پا کر نشہ آور چیزوں یا ظاہر فریب تماشوں میں کھو جاتا ہے اور چاہتا ہے کہ ان میں گم ہو کر اس ذہنی پریشانی سے نجات حاصل کر لے وہ جو کچھ حاصل کر سکتا ہے اس کو حاصل کرنے کی کوشش میں اس کو بھلا دیتا ہے جس کو وہ حاصل نہ کر سکا۔

اس سوال کو ہم ایک لفظ میں "حقیقت کی تلاش" کہہ سکتے ہیں۔ لیکن اگر اس کا تجزیہ کریں تو یہ بہت سے سوالات کا مجموعہ نکلے گا۔ یہ سوالات کیا ہیں ان کو مختلف الفاظ میں ظاہر کیا جا سکتا ہے مگر میں آسانی کے لئے ان کو مندرجہ ذیل تین عنوانات کے تحت بیان کروں گا۔

۱۔ خالق کی تلاش

۲۔ معبود کی تلاش

۳۔ اپنے انجام کی تلاش

حقیقت کی تلاش دراصل نام ہے ان ہی تینوں سوالات کا جواب معلوم کرنے کا۔ آپ خواہ جن الفاظ میں بھی اس سوال کی تشریح کریں مگر حقیقۃً وہ اسی کی بدلی ہوئی تعبیر ہوگی اور ان ہی تین عنوانات کے تحت انھیں اکٹھا کیا جا سکے گا۔

بظاہر یہ سوالات ایسے ہیں جن کے بارہ میں ہم کچھ نہیں جانتے، اور نہ کسی پہاڑ کی چوٹی پر ایسا کوئی بورڈ لگا ہوا نظر آتا ہے جہاں ان کا جواب لکھ کر رکھ دیا گیا ہو۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ جو سوال ہے اسی کے اندر اس کا جواب موجود ہے۔ کائنات اپنی حقیقت کی طرف آپ اشارہ کرتی ہے، اگرچہ وہ ہم کو یقینی علم تک نہیں لے جاتی۔ لیکن یہ اشارہ اتنا واضح اور قطعی ہے کہ اگر ہم کو کسی ذریعہ سے حقیقت کا علم حاصل ہو جائے تو ہمارا ذہن پکار اٹھتا ہے کہ یقیناً یہی حقیقت ہے، اس کے سوا کائنات کی کوئی اور حقیقت نہیں ہو سکتی۔

خالق کی تلاش

کائنات کو دیکھتے ہی جو سب سے پہلا سوال ذہن میں آتا ہے وہ یہ کہ اس کا بنانے والا کون ہے اور وہ کون ہے جو اس عظیم کارخانے کو چلا رہا ہے۔ پچھلے زمانوں میں انسان یہ سمجھتا تھا کہ بہت سی اَن دیکھی طاقتیں اس کائنات کی مالک ہیں۔ ایک بڑے خدا کے تحت بہت سے چھوٹے چھوٹے خدا اس کا انتظام کر رہے ہیں۔ اب بھی بہت سے لوگ اس قسم کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ مگر علمی دنیا میں عام طور پر اب یہ نظریہ ترک کیا جا چکا ہے۔ آج یہ ایک مردہ نظریہ ہے نہ کہ زندہ نظریہ۔ موجودہ زمانہ کے وہ لوگ جو اپنے آپ کو ترقی یافتہ کہتے ہیں اور جن کا خیال ہے کہ وہ جدید دور کے انسان ہیں۔ وہ شرک کے بجائے الحاد کے قائل ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ کائنات کسی ذی شعور ہستی کی کارفرمائی نہیں ہے بلکہ ایک اتفاقی حادثہ کا نتیجہ ہے اور جب کوئی واقعہ وجود میں آجائے

تو اس کے سبب سے کچھ دوسرے واقعات بھی وجود میں آئیں گے۔ اس طرح اسباب و واقعات کا ایک لمبا سلسلہ قائم ہو جاتا ہے اور یہی سلسلۂ اسباب ہے جو کائنات کو چلا رہا ہے۔ اس توجیہ کی بنیاد دو چیزوں پر ہے۔ ایک اتفاق، اور دوسرے قانون علت (Law of Causation)

یہ توجیہ بتاتی ہے کہ اب سے تقریباً دو لاکھ ارب سال (۲۰ نیل سال) پہلے کائنات کا وجود نہ تھا۔ اس وقت ستارے تھے اور نہ سیارے، مگر فضا میں مادہ موجود تھا۔ یہ مادہ اس وقت جمی ہوئی ٹھوس حالت میں نہ تھا، بلکہ اپنے ابتدائی ذرے یعنی برقیے اور پروٹونوں کی شکل میں پوری فضائے بسیط میں یکساں طور پر پھیلا ہوا تھا۔ گویا انتہائی چھوٹے چھوٹے ذرات کا ایک غبار تھا جس سے کائنات بھری ہوئی تھی۔ اس وقت مادہ بالکل توازن کی حالت میں تھا، اس میں کسی قسم کی حرکت نہ تھی۔ ریاضی کے نقطۂ نگاہ سے یہ توازن ایسا تھا کہ اگر اس میں کوئی ذرا سا بھی خلل ڈال دے تو پھر یہ قائم نہیں رہ سکتا، یہ خلل بڑھتا ہی چلا جائے گا۔ اگر اس ابتدائی خلل کو مان لیجئے تو ان لوگوں کا خیال ہے کہ اس کے بعد کے تمام واقعات علمِ ریاضی کے ذریعہ ثابت ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ایسا ہوا کہ مادے کے اس بادل میں خفیف سا خلل واقع ہوا جیسے کسی حوض کے پانی کو کوئی ہاتھ ڈال کر ہلا دے۔ کائنات کی پُرسکون دنیا میں یہ اضطراب کس نے پیدا کیا، اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔ لیکن خلل ہوا اور یہ خلل بڑھتا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مادہ سمٹ سمٹ کر مختلف جگہوں میں جمع ہونا شروع ہو گیا۔ یہی وہ جمع شدہ مادہ ہے جس کو ہم ستارے سیارے اور سحابیے کہتے ہیں۔

کائنات کی یہ توجیہ سائنس کی طرف سے پیش کی گئی تھی مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ اس قدر بودی اور کمزور توجیہ ہے کہ خود سائنس والوں کو بھی اس پر کبھی شرحِ صدر حاصل نہ ہو سکا۔ یہ توجیہ اس حقیقت کو تسلیم کرتی ہے کہ اسے نہیں معلوم کہ کائنات کو پہلی بار کس نے حرکت دی مگر اس کے باوجود اس کا دعویٰ ہے کہ اس نے کائنات کے محرکِ اول کو معلوم کر لیا ہے، اور اس محرکِ اول کا نام اس کے نزدیک اتفاق ہے۔

سوال یہ ہے کہ جب کائنات میں صرف غیر متحرک مادہ تھا، اس کے سوا کوئی چیز موجود نہ تھی تو یہ عجیب و غریب قسم کا اتفاق کہاں سے وجود میں آ گیا جس نے ساری کائنات کو حرکت دے دی۔ جس واقعہ کے اسباب نہ مادہ کے اندر موجود تھے اور نہ مادہ کے باہر۔ وہ واقعہ وجود میں آیا تو کیسے۔ اس توجیہ کا یہ نہایت دلچسپ تضاد ہے کہ وہ ہر واقعہ سے پہلے ایک واقعہ کا موجود ہونا ضروری قرار دیتی ہے جو بعد کو ظاہر ہونے والے واقعہ کا سبب بن سکے مگر اس توجیہ کی ابتدا ایک ایسے واقعہ

سے ہوتی ہے جس سے پہلے اس کا سبب موجود نہیں ۔ یہی وہ بے بنیاد مفروضہ ہے جس پر کائنات کی اتفاقی پیدائش کے نظریہ کی پوری عمارت کھڑی کر دی گئی ہے۔

پھر یہ کائنات اگر محض اتفاق سے وجود میں آئی ہے تو کیا واقعات لازمی طور پر وہی رخ اختیار کرنے پر مجبور تھے جو انھوں نے اختیار کیا۔ کیا اس کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا تھا۔ کیا ایسا ممکن نہیں تھا کہ ستارے آپس میں ٹکرا کر تباہ ہو جائیں۔ مادہ میں حرکت پیدا ہونے کے بعد کیا یہ ضروری تھا کہ یہ محض حرکت نہ رہے بلکہ ایک ارتقائی حرکت بن جائے اور حیرت انگیز تسلسل کے ساتھ موجودہ کائنات کو وجود میں لانے کی طرف دوڑنا شروع کر دے۔

آخر وہ کون سی منطق تھی جس نے ستاروں کے وجود میں آتے ہی ان کو لامتناہی خلا میں نہایت باقاعدگی کے ساتھ پھرانا شروع کر دیا۔ پھر وہ کون سی منطق تھی جس نے کائنات کے ایک بعید ترین گوشہ میں نظامِ شمسی کو وجود دیا۔ پھر وہ کون سی منطق تھی جس سے ہمارے کرۂ زمین پر وہ عجیب و غریب تبدیلیاں ہوئیں جن کی وجہ سے یہاں زندگی کا قیام ممکن ہو سکا اور جن تبدیلیوں کا سراغ آج تک کائنات کی بیشمار دنیاؤں میں سے کسی ایک دنیا میں بھی معلوم نہیں کیا جا سکا ہے۔ پھر وہ کون سی منطق تھی جو ایک خاص مرحلہ پر بے جان مادہ سے جاندار مخلوق پیدا کرنے کا سبب بن گئی۔ کیا اس بات کی کوئی معقول توجیہ کی جا سکتی ہے کہ زمین پر زندگی کس طرح اور کیوں وجود میں آئی اور کس قانون کے تحت مسلسل پیدا ہوتی چلی جا رہی ہے۔

پھر وہ کون سی منطق تھی جس نے کائنات کے ایک چھوٹے سے رقبہ میں حیرت انگیز طور پر وہ تمام چیزیں پیدا کر دیں جو ہماری زندگی اور ہمارے تمدن کے لئے درکار تھیں، پھر وہ کون سی منطق ہے جو ان حالات کو ہمارے لئے باقی رکھے ہوئے ہے۔ کیا محض ایک اتفاق کا پیش آجانا اس بات کی کافی وجہ تھی کہ یہ سارے واقعات اس قدر حسنِ ترتیب کے ساتھ مسلسل پیش آتے چلے جائیں اور اربوں اور کھربوں سال تک ان کا سلسلہ جاری رہے اور پھر بھی ان میں کوئی فرق نہ آنے پائے۔ کیا اس بات کی کوئی واقعی توجیہ کی جا سکتی ہے کہ محض اتفاق سے پیش آنے والے واقعہ میں لزوم کی صفت کہاں سے آگئی اور اتنے عجیب و غریب طریقہ پر مسلسل ارتقاء کرنے کا رجحان اس میں کہاں سے پیدا ہو گیا۔

یہ اس سوال کا جواب تھا کہ کائنات کیسے پیدا ہوئی۔ اس کے بعد یہ سوال اٹھا کہ اس کا چلانے والا کون ہے۔ وہ کون ہے جو اس عظیم کارخانے کو اس قدر منظم طریقہ پر حرکت دے

رہا ہے۔ اس توجیہ میں جس کو کائنات کا خالق قرار دیا گیا ہے اسی کو کائنات کا حاکم نہیں قرار دیا جا سکتا۔ یہ توجیہ عین اپنی ساخت کے اعتبار سے دو خدا چاہتی ہے۔ کیوں کہ حرکتِ اول کی توجیہ کے لئے تو اتفاق کا نام لیا جا سکتا ہے مگر اس کے بعد کی مسلسل حرکت کو کسی حال میں بھی اتفاق نہیں کہا جا سکتا۔ اس کی توجیہ کے لئے دوسرا خدا تلاش کرنا پڑے گا۔

اس مشکل کو حل کرنے کے لئے اصول تعلیل (Principle of Causation) پیش کیا گیا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ حرکت اول کے بعد کائنات میں علت اور معلول کا ایک ایسا سلسلہ قائم ہو گیا ہے کہ ایک کے بعد ایک تمام واقعات پیش آتے چلے جا رہے ہیں، بالکل اسی طرح جیسے بچے بہت سی اینٹیں کھڑی کر کے کنارے کی ایک اینٹ گرا دیتے ہیں تو اس کے بعد کی تمام اینٹیں خود بخود گرتی چلی جاتی ہیں۔ جو واقعہ ظہور میں آتا ہے اس کا سبب کائنات کے باہر کہیں موجود نہیں ہے بلکہ ناقابل تسخیر قوانین کے تحت حالات ماقبل کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے۔ اور یہ سابقہ حالات بھی اپنے سے پہلے واقعات کا لازمی نتیجہ تھے۔ اس طرح کائنات میں علت اور معلول کا ایک لامتناہی سلسلہ قائم ہو گیا ہے۔ حتیٰ کہ جس صورت میں تاریخِ عالم کا آغاز ہوا، اس نے آئندہ سلسلۂ واقعات کا قطعی فیصلہ کر دیا ہے۔ جب ابتدائی صورت ایک دفعہ معین ہو گئی تو قدرت صرف ایک ہی طریق سے منزل مقصود تک پہنچ سکتی تھی۔ گویا کائنات جس روز پیدا ہوئی اس کی آئندہ تاریخ بھی اسی دن متعین ہو چکی ہے۔

اس اصول کو قدرت کا اساسی قانون مقرر کرنا سترہویں صدی کا ایک بہت بڑا واقعہ تھا۔ چنانچہ یہ تحریک شروع ہوئی کہ تمام کائنات کو ایک مشین ثابت کیا جائے۔ انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں یہ تحریک اپنے پورے عروج پر آ گئی۔ یہ زمانہ سائنس داں انجینیروں کا تھا جن کی دلی خواہش تھی کہ قدرت کے مشینی ماڈل بنائے جائیں۔ اسی زمانہ میں ہیلم ہولٹز (Helm Holtz) نے کہا تھا کہ تمام قدرتی سائنسوں کا آخری مقصد اپنے آپ کو میکانکس میں منتقل کر لینا ہے۔ اگرچہ اس اصول کے مطابق کائنات کے تمام مظاہر کی تشریح کرنے میں ابھی سائنسدانوں کو کامیابی نہیں ہوئی تھی مگر ان کا یقین تھا کہ کائنات کی تشریح میکانکی پیرائے میں ہو سکتی ہے وہ سمجھتے تھے کہ صرف تھوڑی سی کوشش کی ضرورت ہے اور بالآخر تمام عالم ایک مکمل چلتی ہوئی مشین ثابت ہو جائے گا۔

ان باتوں کا انسانی زندگی سے تعلق صاف ظاہر تھا۔ اصولِ تعلیل کی ہر توسیع اور قدرت

کی ہر کامیاب میکانکی تشریح نے اختیار انسانی پر یقین کرنا محال بنا دیا، کیوں کہ اگر یہ اصول تمام قدرت پر حاوی ہے تو زندگی اس سے کیوں مستثنیٰ ہو سکتی ہے۔ اس طرز فکر کے نتیجہ میں سترھویں اور اٹھارھویں صدی کے میکانکی فلسفے وجود میں آئے جب یہ دریافت ہوا کہ (Living Cell) جاندار خلیہ بھی بے جان مادہ کی طرح محض کیمیاوی جوہروں سے بنا ہے تو فوراً سوال پیدا ہوا کہ وہ خاص اجزا جن سے ہمارے جسم و دماغ بنے ہوئے ہیں کیوں کر اصول تعلیل کے دائرہ سے باہر ہو سکتے ہیں چنانچہ یہ گمان کیا گیا بلکہ بڑے جوش کے ساتھ دعویٰ کر دیا گیا کہ زندگی بھی ایک خالص مشین ہے یہاں تک کہا گیا کہ نیوٹن، باخ (Bach) اور مایئکل انجلو (Michel Angelo) کے دماغ کسی پرنٹنگ مشین سے صرف پیچیدگی میں مختلف تھے اور ان کا کام صرف یہ تھا کہ بیرونی محرکات کا مکمل جواب دیں۔

مگر سائنس اس سخت اور غیر معتدل قسم کے اصول علیت کی اب قائل نہیں ہے۔ نظریۂ اضافیت اصول تعلیل کو دھوکے (Elusion) کے لفظ سے یاد کرتا ہے۔ انیسویں صدی کے آخر ہی میں سائنس پر یہ واضح ہو گیا تھا کہ کائنات کے بہت سے مظاہر، بالخصوص روشنی اور قوت کشش، میکانکی تشریح کی ہر کوشش کو ناکام بنا دیتے ہیں۔ یہ بحث ابھی جاری تھی کہ کیا ایسی مشین بنائی جا سکتی ہے جو نیوٹن کے افکار، باخ کے جذبات اور مایئکل انجلو کے خیالات کا اعادہ کر سکے مگر سائنس والوں کو بڑی تیزی سے یقین ہوتا جا رہا تھا کہ شمع کی روشنی اور سیب کا گرنا کوئی مشین نہیں دہرا سکتی۔ قدیم سائنس نے بڑے وثوق سے اعلان کیا تھا کہ قدرت صرف ایک ہی راستہ اختیار کر سکتی ہے جو اول روز سے علت اور معلول کی مسلسل کڑی کے مطابق ابد تک کے لئے معین ہو چکا ہے۔ مگر بالآخر سائنس کو خود یہ تسلیم کرنا پڑا کہ کائنات کا ماضی اس قدر اٹل طور پر اس کے مستقبل کا سبب نہیں ہے جیسا کہ پہلے خیال کیا جاتا تھا۔ موجودہ معلومات کی روشنی میں سائنس والوں کی ایک بڑی اکثریت کا اب اس بات پر اتفاق ہے کہ علم کا دریا ہمیں ایک غیر میکانکی حقیقت (Non-mechanical Reality) کی طرف لئے جا رہا ہے۔

کائنات کی پیدائش اور اس کی حرکت کے بارہ میں یہ دونوں نظریئے جو سائنسی ترتیبوں کے ساتھ وجود میں آئے تھے اب تک یقین کی دولت سے محروم ہیں۔ جدید تحقیقات ان کی بنیاد کو مضبوط نہیں بناتی بلکہ اور کمزور کر دیتی ہے۔ اس طرح گویا سائنس خود ہی اس نظریہ کی تردید کر رہی ہے، اب انسان دوبارہ اسی منزل پر پہونچ گیا ہے جس کو چھوڑ کر اس نے اپنا

نیا سفر شروع کیا تھا۔

معبود کی تلاش

یہ خالق کی تلاش کا مسئلہ تھا۔ اس کے بعد دوسری چیز جو انسان جاننا چاہتا ہے وہ یہ کہ "میرا معبود کون ہے" ہم اپنی زندگی میں صریح طور پر ایک خلا محسوس کرتے ہیں مگر ہم نہیں جانتے کہ اس خلا کو کیسے پر کریں۔ یہی خلا کا احساس ہے جس کو میں نے "معبود کی تلاش" سے تعبیر کیا ہے۔ یہ احساس دو پہلوؤں سے ہوتا ہے۔

اپنے وجود اور باہر کی دنیا پر جب ہم غور کرتے ہیں تو دو نہایت شدید جذبے ہمارے اندر پیدا ہوتے ہیں۔ پہلا شکر اور احسان مندی کا اور دوسرا کمزوری اور عجز کا۔

ہم اپنی زندگی کے جس گوشہ میں بھی نظر ڈالتے ہیں ہمیں صاف دکھائی دیتا ہے کہ ہماری زندگی کسی کے احسانات سے ڈھکی ہوئی ہے یہ دیکھ کر دینے والے کے لئے ہمارے اندر بے پناہ جذبۂ شکر امنڈتا ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ اپنی بہترین عقیدتوں کو اپنے محسن پر قربان کرسکیں۔ یہ تلاش ہمارے لئے محض ایک فلسفیانہ نوعیت کی چیز نہیں ہے بلکہ ہماری نفسیات سے اس کا گہرا تعلق ہے یہ سوال محض ایک خارجی مسئلہ کو حل کرنے کا سوال نہیں ہے بلکہ یہ ہماری ایک اندرونی طلب ہے اور ہمارا پورا وجود اس سوال کا جواب معلوم کرنا چاہتا ہے۔

غور کیجئے، کیا کوئی شریف آدمی اس حقیقت کو نظر انداز کرسکتا ہے کہ وہ کائنات میں ایک مستقل واقعہ کی حیثیت سے موجود ہے حالانکہ اس میں اس کی اپنی کوششوں کا کوئی دخل نہیں ہے وہ اپنے آپ کو ایک ایسے جسم میں پا رہا ہے جس سے بہتر جسم کا وہ تصور نہیں کرسکتا حالانکہ اس جسم کو اس نے خود نہیں بنایا ہے۔ اس کو ایسی عجیب وغریب قسم کی ذہنی قوتیں حاصل ہیں جو کسی بھی دوسرے جاندار کو نہیں دی گئی ہیں حالانکہ ان قوتوں کو حاصل کرنے کے لئے اس نے کچھ بھی نہیں کیا ہے اور نہ وہ کچھ کرسکتا ہے۔ ہمارا وجود ذاتی نہیں ہے بلکہ عطیہ ہے۔ یہ عطیہ کس نے دیا ہے، انسانی فطرت اس سوال کا جواب معلوم کرنا چاہتی ہے تاکہ وہ اپنے اس عظیم محسن کا شکر ادا کرسکے۔

پھر اپنے جسم کے باہر دیکھئے۔ دنیا میں ہم اس حال میں پیدا ہوتے ہیں کہ ہمارے پاس اپنا کچھ بھی نہیں ہوتا، نہ ہم کو کائنات کے اوپر کوئی اختیار حاصل ہے کہ ہم اس کو اپنی ضرورت

کے مطابق بناسکیں۔ ہماری ہزاروں ضرورتیں ہیں۔ مگر کسی ایک ضرورت کو بھی ہم خود سے پورا نہیں کرسکتے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں حیرت انگیز طور پر ہماری تمام ضرورتوں کو پورا کرنے کا انتظام کیا گیا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کائنات اپنے تمام ساز و سامان کے ساتھ اس بات کی منتظر ہے کہ انسان پیدا ہو اور وہ اس کی خدمت میں لگ جائے۔

مثال کے طور پر آواز کو لیجئے جس کے ذریعہ سے ہم اپنا خیال دوسروں تک پہونچاتے ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہوا کہ ہمارے ذہن میں پیدا ہونے والے خیالات زبان کا ارتعاش بن کر دوسرے کے کان تک پہونچیں اور وہ ان کو قابل فہم آوازوں کی صورت میں سن سکے۔ اس کے لئے ہمارے اندر اور باہر بیشمار انتظامات کئے گئے ہیں جن میں سے ایک وہ درمیانی واسطہ ہے جس کو ہم ہوا کہتے ہیں۔ ہم جو الفاظ بولتے ہیں وہ بے آواز لہروں کی صورت میں ہوا پر اسی طرح سفر کرتے ہیں جس طرح پانی کی سطح پر موجیں پیدا ہوتی ہیں اور بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ میرے منھ سے نکلی ہوئی آواز کے آپ تک پہونچنے کے لئے درمیان میں ہوا کا موجود ہونا ضروری ہے۔ اگر یہ درمیانی واسطہ نہ ہو تو آپ میرے ہونٹ ہلتے ہوئے دیکھیں گے مگر میری آواز نہ سنیں گے۔ مثال کے طور پر ایک بند فانوس کے اندر برقی گھنٹی رکھ کر اسے بجایا جائے تو اس کی آواز صاف سنائی دے گی۔ لیکن اگر فانوس کے اندر کی ہوا کو پوری طرح نکال دیا جائے اور اس کے بعد گھنٹی بجائی جائے تو آپ شیشہ کے اندر گھنٹی کو بجتا ہوا دیکھیں گے مگر اس کی آواز بالکل سنائی نہ دے گی۔ کیوں کہ گھنٹی کے بجنے سے جو ارتعاش پیدا ہوتا ہے اس کو قبول کرکے آپ کے کانوں تک پہنچانے کے لئے فانوس کے اندر ہوا موجود نہیں ہے۔

مگر یہ ذریعہ بھی ناکافی ہے کیونکہ ہوا کے ذریعہ ہماری آواز پانچ سکنڈ میں صرف ایک میل کا فاصلہ طے کرتی ہے۔ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ ہوا کا ذریعہ صرف قریبی ماحول میں گفتگو کے لئے کار آمد ہے، وہ ہماری آواز کو دور تک نہیں پہنچا سکتا۔ اگر آواز صرف ہوا کے ذریعہ پھیلتی تو اس کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانا ممکن نہ ہوتا۔ مگر قدرت نے اس کے لئے ہمیں ایک اور انتہائی تیز رفتار ذریعہ مہیا کیا ہے، یہ روشنی یا برقی رو ہے جس کی رفتار ایک سکنڈ میں ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل ہے۔ لاسلکی پیغامات میں اسی ذریعہ سے کام لیا جاتا ہے۔ جب کوئی مقرر ریڈیو اسٹیشن میں لگے ہوئے مائکروفون کے قریب آواز نکالتا ہے تو مائکروفون آواز کو جذب کرکے اسے برقی رو میں تبدیل کر دیتا ہے اور تار کے ذریعہ اس کو آلہ نشر یا ٹرانس میٹر تک بھیج دیتا ہے۔

آلات نشر آواز کے پہونچتے ہی مرتعش ہو کر فضا میں وہی ارتعاش پیدا کر دیتے ہیں۔ اس طرح پانچ سکنڈ میں ایک میل چلنے والی آواز برقی لہروں میں تبدیل ہو کر ایک سکنڈ میں دو لاکھ میل کی رفتار حاصل کر لیتی ہے۔ اور دم بھر میں ساری دنیا میں پھیل جاتی ہے۔ یہی لاسلکی موجیں ہیں جن کو ہمارے ریڈیو سٹ کی آواز گیر مشین قبول کر کے بلند آواز میں ان کا اعادہ کر دیتی ہے اور پھر ہزاروں میل دور بولی ہوئی آواز کو ہم کسی تاخیر کے بغیر سننے لگتے ہیں۔

یہ ان بیشمار انتظامات میں سے ایک ہے جس کو میں نے بیان نہیں کیا ہے بلکہ اس کا صرف نام لیا ہے۔ اگر اس کا اور دوسری چیزوں کا تفصیلی ذکر کیا جائے تو اس کے لئے کروروں صفحے درکار ہوں گے اور پھر بھی ان کا بیان ختم نہ ہوگا۔

یہ عطیات جن سے ہر آن آدمی دوچار ہو رہا ہے اور جن کے بغیر اس زمین پر انسانی زندگی اور تمدن کا کوئی تصور نہیں کیا جا سکتا، انسان جاننا چاہتا ہے کہ یہ سب کس نے اس کے لئے مہیّا کیا ہے ہر آن جب وہ کسی نعمت سے دوچار ہوتا ہے تو اس کے دل میں بے پناہ جذبۂ شکر امنڈتا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ اپنے محسن کو پائے اور اپنے آپ کو اس کے قدموں میں ڈال دے۔ محسن کے احسانات کو ماننا، اس کو اپنے دل کی گہرائیوں میں جگہ دینا اور اس کی خدمت میں اپنے بہترین جذبات کو نذر کرنا یہ انسانی فطرت کا شریف ترین جذبہ ہے۔ ہر آدمی جو اپنی زندگی اور کائنات پر غور کرتا ہے اس کے اندر نہایت شدت سے یہ جذبہ ابھرتا ہے۔ پھر کیا اس جذبہ کا کوئی جواب نہیں۔ کیا انسان اس کائنات کے اندر ایک یتیم بچہ ہے جس کے اندر امنڈتے ہوئے جذبات محبت کی تسکین کے لئے کوئی ہستی موجود نہ ہو۔ کیا یہ ایک ایسی کائنات ہے جہاں احسانات ہیں مگر محسن کا پتہ نہیں جہاں جذبہ ہے مگر جذبہ کی تسکین کا کوئی ذریعہ نہیں۔

یہ معبود کی تلاش کا ایک پہلو ہے۔ اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ انسان کے حالات فطری طور پر تقاضا کرتے ہیں کہ کائنات کے اندر اس کا کوئی سہارا ہو۔ اگر ہم آنکھ کھول کر دیکھیں تو ہم اس دنیا میں ایک انتہائی عاجز اور بے بس مخلوق ہیں۔ ذرا اس خلا کا تصور کیجئے جس میں ہماری یہ زمین سورج کے گرد چکر لگا رہی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ زمین کی گولائی تقریباً ۲۵ ہزار میل ہے۔ اور وہ ناچتے ہوئے لٹو کے مانند اپنے محور پر مسلسل اس طرح گھوم رہی ہے کہ ہر ۲۴ گھنٹے میں ایک چکر پورا ہو جاتا ہے۔ گویا اس کی رفتار تقریباً ایک ہزار میل فی گھنٹہ ہے۔ اسی کے ساتھ وہ سورج کے چاروں طرف اٹھارہ کرور ساٹھ لاکھ میل کے لمبے دائرہ میں نہایت تیزی سے دوڑ رہی ہے۔

خلا کے اندر اس قدر تیز دوڑتی ہوئی زمین پر ہمارا وجود قائم رکھنے کے لئے زمین کی رفتار کو ایک خاص اندازہ کے مطابق رکھا گیا ہے اگر ایسا نہ ہو تو زمین کے اوپر انسان کی حالت ان سنگ ریزوں کی مانند ہو جائے جو کسی متحرک پہیہ پر رکھ دیئے گئے ہوں، اسی کے ساتھ مزید انتظام یہ ہے کہ زمین کی کشش ہم کو کھینچے ہوئے ہے اور اوپر سے ہوا کا زبردست دباؤ پڑتا ہے۔ ہوا کے ذریعہ جو دباؤ پڑ رہا ہے وہ جسم کے ہر مربع انچ پر پندرہ پونڈ تک معلوم کیا گیا ہے یعنی ایک اوسط آدمی کے سارے جسم پر تقریباً ۲۸۰ من کا دباؤ۔ ان حیرت انگیز انتظامات نے ہم کو خلا میں مسلسل دوڑتی ہوئی زمین کے چاروں طرف قائم کر رکھا ہے۔

پھر ذرا سورج پر غور کیجئے۔ سورج کی جسامت آٹھ لاکھ ۶۵ ہزار میل ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہماری زمین سے دس لاکھ گنا بڑا ہے۔ یہ سورج آگ کا دہکتا ہوا سمندر ہے جس کے قریب کوئی بھی چیز ٹھوس حالت میں نہیں رہ سکتی۔ زمین اور سورج کے درمیان اس وقت تقریباً ساڑھے نو کروڑ میل کا فاصلہ ہے، اگر اس کے بجائے وہ اس کے نصف فاصلہ پر ہو تو سورج کی گرمی سے چیزیں جلنے لگیں۔ اور اگر وہ چاند کی جگہ یعنی دو لاکھ چالیس ہزار میل کے فاصلہ پر آجائے تو زمین پگھل کر بخارات میں تبدیل ہو جائے۔ یہی سورج ہے جس سے زمین پر زندگی کے تمام مظاہر قائم ہیں۔ اس مقصد کے لئے اس کو ایک خاص فاصلہ پر رکھا گیا ہے۔ اگر وہ دوچند فاصلے پر چلا جائے تو زمین برف کی طرح جم جائے اور اگر قریب آجائے تو ہم سب لوگ جل بھن کر خاک ہو جائیں۔

پھر ذرا اس کائنات کی وسعت کو دیکھئے اور اس قوتِ کشش پر غور کیجئے جو اس عظیم کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے۔ کائنات ایک بے انتہا وسیع کارخانہ ہے، اس کی وسعت کا اندازہ ماہرین فلکیات کے نزدیک یہ ہے کہ روشنی جس کی رفتار ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سکنڈ ہے، اس کو کائنات کے گرد ایک چکر لگانے میں کئی ارب برس درکار ہوں گے۔ یہ نظام شمسی جس کے اندر ہماری زمین ہے، بظاہر بہت بڑا معلوم ہوتا ہے مگر پوری کائنات کے مقابلہ میں اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ کائنات میں اس سے بہت بڑے بڑے بے شمار ستارے لامحدود وسعتوں میں پھیلے ہوئے ہیں جن میں بہت سے اتنے بڑے ہیں کہ ہمارا پورا نظام شمسی اس کے اوپر رکھا جا سکتا ہے۔ جو قوت کشش ان بیشمار دنیاؤں کو سنبھالے ہوئے ہے، اس کی عظمت کا تصور اس سے کیجئے کہ سورج جس بے پناہ طاقت سے زمین کو

اپنی طرف کھینچ رہا ہے اور اس کو وسیع ترین فضا میں گر کر برباد ہو جانے سے روکتا ہے، یا یہ غیر مرئی طاقت اس قدر قوی ہے کہ اگر اس مقصد کے لئے کسی مادی شے سے زمین کو باندھنا پڑتا تو جس طرح گھاس کی پتیاں زمین کو ڈھانکے ہوئے ہیں، اسی طرح دھاتی تاروں سے کرۂ ارض ڈھک جاتا۔

ہماری زندگی بالکلیہ ایسی طاقتوں کے رحم و کرم پر ہے جن پر ہمارا کوئی اختیار نہیں۔ انسان کی زندگی کے لئے دنیا میں جو انتظامات ہیں اور جن کی موجودگی کے بغیر انسانی زندگی کا تصور نہیں کیا جا سکتا، وہ اتنے بلند پیمانہ پر ہو رہے ہیں اور ان کو وجود میں لانے کے لئے اتنی غیر معمولی قوت تصرف درکار ہے کہ انسان خود سے انھیں وجود میں لانے کا تصور نہیں کر سکتا موجودات کے لئے جو طریق عمل مقرر کیا گیا ہے، اس کا مقرر کرنا تو درکنار اس پر کنٹرول کرنا بھی انسان کے بس کی بات نہیں۔ وہ دیکھتا ہے کہ اگر کائنات کی غیر معمولی قوتیں میرے ساتھ ہم آہنگی نہ کریں تو میں زمین پر ٹھہر بھی نہیں سکتا، اس کے اوپر ایک متمدن زندگی کی تعمیر تو بہت دور کی بات ہے۔

ایسی ایک کائنات کے اندر جب انسان اپنے حقیر وجود کو دیکھتا ہے تو وہ اپنے آپ کو اس سے بھی زیادہ بے بس محسوس کرنے لگتا ہے جتنا کہ سمندر کی موجوں کے درمیان ایک چیونٹی اپنے آپ کو بچانے کی جدوجہد کر رہی ہو۔ وہ بے اختیار چاہتا ہے کہ کوئی ہو جو اس اتھاہ کائنات میں اس کا سہارا بن سکے۔ وہ ایک ایسی ہستی کی پناہ ڈھونڈھنا چاہتا ہے جو کائنات کی قوتوں سے بالاتر ہو اور جس کی پناہ میں آجانے کے بعد وہ اپنے آپ کو محفوظ و مامون تصور کر سکے۔

یہ دو جذبے ہیں جن کو میں نے معبود کی تلاش کا عنوان دیا ہے۔ معبود کی تلاش در اصل ایک فطری جذبہ ہے جس کا مطلب ایک ایسی ہستی کی تلاش ہے جو آدمی کی محبت اور اس کے اعتماد کا مرکز بن سکے۔ موجودہ زمانہ میں قوم، وطن اور ریاست کو انسان کی اس طلب کا جواب بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ جدید تہذیب یہ کہتی ہے کہ اپنی قوم، اپنے وطن اور اپنی ریاست کو یہ مقام دو کہ وہ تمہاری عقیدتوں کا مرکز بنے اور اس سے وابستگی کو اپنا سہارا بناؤ۔ ان چیزوں کو معبود کے نام پر پیش نہیں کیا جاتا مگر زندگی میں ان کو جو مقام دیا گیا ہے وہ تقریباً وہی ہے جو در اصل ایک معبود کا ہونا چاہئے۔ مگر ان چیزوں

کو معبود کی جگہ دینا بالکل ایسا ہی ہے جیسے کسی کو ایک رفیق زندگی کی ضرورت ہو تو اس کی خدمت میں آپ پتھر کی ایک سل پیش کر دیں۔ کھلی ہوئی بات ہے کہ انسان کے اندر تلاش کا یہ جذبہ جو ابھرتا ہے اس کے اسباب انسانی نفسیات میں بہت گہرائی تک پھیلے ہوئے ہیں، وہ ایک ایسی ہستی کی تلاش میں ہے جو ساری کائنات پر محیط ہو۔ اس طلب کا جواب کسی جغرافیائی خطہ میں نہیں مل سکتا۔ یہ چیزیں زیادہ سے زیادہ ایک سماج کی تعمیر میں کچھ مدد دے سکتی ہیں مگر وہ انسان کے تلاش معبود کے جذبے کی تسکین نہیں بن سکتیں، اس کے لئے ایک کائناتی وجود درکار ہے۔ انسان کو اپنی محبتوں کے مرکز کے لئے ایک ایسا وجود چاہیئے جس نے زمین و آسمان کو بنایا ہو۔ اپنے سہارے کے لئے اسے ایک ایسی طاقت کی تلاش ہے جو کائنات کے اوپر حکمراں ہو۔ جب تک انسان ایسے ایک وجود کو نہیں پائے گا اس کا خلا بدستور باقی رہے گا، کوئی دوسری چیز اسے پر کرنے والی نہیں بن سکتی

انجام کی تلاش

حقیقت کی تلاش کا تیسرا جزء اپنے انجام کی تلاش ہے۔ آدمی یہ جاننا چاہتا ہے کہ وہ کہاں سے آیا ہے اور کہاں جائے گا۔ وہ اپنے اندر بہت سے حوصلے اور تمنائیں پاتا ہے وہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ ان کی تسکین کس طرح ہوگی۔ وہ موجودہ محدود زندگی کے مقابلہ میں ایک طویل تر زندگی چاہتا ہے مگر نہیں جانتا کہ وہ اس کو کہاں پائے گا۔ اس کے اندر بہت سے اخلاقی اور انسانی احساسات ہیں جو دنیا میں بری طرح پامال کئے جا رہے ہیں۔ اس کے ذہن میں یہ سوال اٹھتا ہے کہ کیا وہ اپنی پسندیدہ دنیا کو حاصل نہ کر سکے گا۔ یہ سوالات کس طرح انسان کے اندر سے ابلتے ہیں اور کائنات کا مطالعہ کس طرح اس کے ذہن میں یہ سوال پیدا کرتا ہے، اس موقع پر اس کی تھوڑی سی تفصیل مناسب ہوگی۔

ماہرین حیاتیات کا خیال ہے کہ انسان اپنی موجودہ شکل میں تین لاکھ برس سے زمین پر موجود ہے۔ اس کے مقابلہ میں کائنات کی عمر بہت زیادہ ہے یعنی دو لاکھ ارب سال (۲۰ نیل سال)، اس سے پہلے کائنات برقی ذرات کے ایک غبار کی شکل میں تھی، پھر اس میں حرکت ہوئی اور مادہ سمٹ سمٹ کر مختلف جگہوں میں جمع ہونا شروع ہوگیا۔ یہی وہ جمع شدہ مادہ ہے جس کو ہم ستارے، سیارے یا سحابیئے کہتے ہیں۔ یہ مادی ٹکڑے گیس کے

مہیب گولے کی شکل میں نامعلوم مدت تک فضا میں گردش کرتے رہے۔ تقریباً دو ارب سال پہلے ایسا ہوا کہ کائنات کا کوئی بڑا ستارہ فضا میں سفر کرتا ہوا آفتاب کے قریب آنکلا جو اس وقت اب سے بہت بڑا تھا۔ جس طرح چاند کی کشش سے سمندر میں اونچی اونچی لہریں اٹھتی ہیں اسی طرح اس دوسرے ستارے کی کشش سے ہمارے آفتاب پر ایک عظیم طوفان برپا ہوا، زبردست لہریں پیدا ہوئیں جو رفتہ رفتہ نہایت بلند ہوئیں اور قبل اس کے کہ وہ ستارہ آفتاب سے دور ہٹنا شروع ہو، اس کی قوت کشش اتنی زیادہ بڑھ گئی کہ آفتاب کی ان زبردست گیسی لہروں کے کچھ حصے ٹوٹ کر ایک جھٹکے کے ساتھ دور فضا میں نکل گئے۔ یہی بعد کو ٹھنڈے ہو کر نظام شمسی کے توابع بنے۔ اس وقت یہ سب ٹکڑے آفتاب کے گرد گھوم رہے ہیں اور ان ہی میں سے ایک ہماری زمین ہے۔

زمین ابتداءً ایک شعلہ کی حالت میں سورج کے گرد گھوم رہی تھی، مگر پھر فضا میں مسلسل حرارت خارج کرنے کی وجہ سے ٹھنڈی ہونا شروع ہوئی، یہ عمل کروڑوں برس ہوتا رہا یہاں تک کہ وہ بالکل سرد ہوگئی۔ مگر سورج کی گرمی اب بھی اس پر پڑ رہی تھی جس کی وجہ سے بخارات اٹھنا شروع ہوئے اور گھٹاؤں کی شکل میں اس کی فضا کے اوپر چھاگئے۔ پھر یہ بادل برسنا شروع ہوئے اور ساری زمین پانی سے بھر گئی۔ زمین کا اوپری حصہ اگرچہ ٹھنڈا ہو گیا تھا مگر اس کا اندرونی حصہ اب بھی گرم تھا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زمین سکڑنے لگی۔ اس کی وجہ سے زمین کے اندر کی گرم گیسوں پر دباؤ پڑا اور وہ باہر نکلنے کے لئے بے قرار ہوگئیں، تھوڑے تھوڑے عرصے کے بعد زمین پھٹنے لگی۔ جگہ جگہ بڑے بڑے شگاف پڑ گئے، اس طرح بحری طوفانوں، خوفناک زلزلوں اور آتش فشاں دھماکوں میں ہزاروں سال گزر گئے۔ ان ہی زلزلوں سے زمین کا کچھ حصہ اوپر ابھر آیا اور کچھ حصہ دب گیا۔ دبے ہوئے حصوں میں پانی بھر گیا اور وہ سمندر کہلائے اور ابھرے ہوئے حصوں نے براعظم کی صورت اختیار کی بعض اوقات یہ ابھار اس طرح واقع ہوا کہ بڑی بڑی اونچی باڑھیں سی بن گئیں، یہ دنیا کے پہلے پہاڑ تھے۔

ماہرین ارضیات کا خیال ہے کہ ایک ارب ۲۳ کروڑ سال ہوئے، جب پہلی بار زمین پر زندگی پیدا ہوئی۔ یہ چھوٹے چھوٹے کیڑے تھے جو پانی کے کنارے وجود میں آئے۔ اس کے بعد مختلف قسم کے جانور پیدا ہوتے اور مرتے رہے۔ کئی ہزار سال تک زمین پر صرف

جانور رہے۔ اس کے بعد سمندری پودے نمودار ہوئے اور خشکی پر بھی گھاس اگنا شروع ہوئی۔ اس طرح لمبی مدت تک بے شمار واقعات ظہور میں آتے رہے، یہاں تک کہ انسانی زندگی کے لئے حالات سازگار ہوئے اور زمین پر انسان پیدا ہوا۔

اس نظریہ کے مطابق انسان کی ابتدا پچھلے تین لاکھ سال سے ہوئی ہے۔ یہ مدت بہت ہی کم ہے۔ وقت کے جو فاصلے کائنات نے طے کئے ہیں ان کے مقابلہ میں انسانی تاریخ چشم زدن سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ پھر اگر انسانیت کی اکائی کو لیجئے تو معلوم ہوگا کہ ایک انسان کی عمر کا اوسط سو سال سے بھی کم ہے۔ ایک طرف اس واقعہ کو سامنے رکھئے اور پھر اس حقیقت پر غور کیجئے کہ کائنات میں انسان سے بہتر کوئی وجود معلوم نہیں کیا جاسکا ہے۔ زمین و آسمان کی اربوں اور کھربوں سال کی گردش کے بعد جو بہترین مخلوق اس کائنات کے اندر وجود میں آئی ہے وہ انسان ہے۔ مگر یہ حیرت انگیز انسان جو ساری دنیا پر فوقیت رکھتا ہے، جو تمام موجودات میں سب سے افضل ہے اس کی زندگی چند سال سے زیادہ نہیں۔ ہمارا وجود جن مادی اجزاء سے مرکب ہے ان کی عمر تو اربوں اور کھربوں سال ہو اور وہ ہمارے مرنے کے بعد بھی باقی رہ جائیں مگر ان مادی اجزاء کی یکجائی سے جو اعلیٰ ترین وجود بنتا ہے وہ صرف سو برس زندہ رہے۔ جو کائنات کا حاصل ہے وہ کائنات سے بھی کم عمر رکھتا ہے تاریخ کے طویل ترین دور میں بے شمار واقعات کیا صرف اس لئے جمع ہوئے تھے کہ ایک انسان کو چند دنوں کے لئے پیدا کرکے ختم ہوجائیں۔

زمین پر آج جتنے انسان پائے جاتے ہیں اگر ان میں کا ہر آدمی چھ فٹ لمبا، ڈھائی فٹ چوڑا اور ایک فٹ موٹا ہو تو اس پوری آبادی کو بہ آسانی ایک ایسے صندوق میں بند کیا جاسکتا ہے جو طول و عرض اور بلندی میں ایک میل ہو۔ بات کچھ عجیب سی معلوم ہوتی ہے مگر حقیقت یہی ہے۔ پھر اگر اس صندوق کو کسی سمندر کے کنارے لے جاکر ایک ہلکا سا دھکا دے دیں تو یہ صندوق پانی کی گہرائی میں جا گرے گا۔ صدیاں گزر جائیں گی، نسل انسانی اپنے کفن میں لپٹی ہوئی ہمیشہ کے لئے پڑی رہے گی، دنیا کے ذہن سے یہ بھی محو ہوجائے گا کہ یہاں کبھی انسان کی قسم کی کوئی نسل آباد تھی۔ سمندر کی سطح پر اسی طرح بدستور طوفان آتے رہیں گے، سورج اسی طرح چمکتا رہے گا، کرۂ ارض اپنے محور پر بدستور چکر کرتا رہے گا، کائنات کی لامحدود پہنائیوں میں پھیلی ہوئی بے شمار دنیائیں اتنے بڑے

حادثہ کو ایک معمولی واقعہ سے زیادہ اہمیت نہ دیں گی۔ کئی صدیوں کے بعد ایک اونچا سا مٹی کا ڈھیر زبان حال سے بتائے گا کہ یہ نسل انسانی کی قبر ہے جہاں وہ صدیوں پہلے ایک چھوٹے سے صندوق میں دفن کی گئی تھی۔

کیا انسان کی قیمت بس اسی قدر ہے، مادہ کو کوٹیے، پیٹیے، جلائیے، کچھ بھی کیجئے، وہ ختم نہیں ہوتا، وہ ہر حال میں اپنے وجود کو باقی رکھتا ہے مگر انسان جو مادہ سے برتر مخلوق ہے کیا اس کے لئے بقا نہیں۔ یہ زندگی جو ساری کائنات کا خلاصہ ہے، کیا وہ اتنی بے حقیقت ہے کہ اتنی آسانی سے اسے ختم کیا جا سکتا ہے۔ کیا انسانی زندگی کا منتہا بس یہی ہے کہ وہ کائنات میں اپنے ننھے سے وطن پر چند دنوں کے لئے پیدا ہو اور پھر فنا ہو کر رہ جائے تمام انسانی علم اور ہماری کامرانیوں کے سارے واقعات ہمارے ساتھ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائیں اور کائنات اس طرح باقی رہ جائے گویا نسل انسانی اس کے نزدیک کوئی حقیقت ہی نہیں تھی۔

اس سلسلہ میں دوسری چیز جو صریح طور پر محسوس ہوتی ہے وہ یہ کہ اگر زندگی بس اسی دنیا کی زندگی ہے تو یہ ایک ایسی زندگی ہے جس میں ہماری امنگوں کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ ہر انسان لامحدود مدت تک زندہ رہنا چاہتا ہے، کسی کو بھی موت پسند نہیں، مگر اس دنیا میں ہر پیدا ہونے والا جانتا ہے کہ وہ ایسی زندگی سے محروم ہے۔ آدمی خوشی حاصل کرنا چاہتا ہے، ہر آدمی کی یہ خواہش ہے کہ وہ دکھ درد اور ہر قسم کی تکلیفوں سے محفوظ رہ کر زندگی گزارے، مگر حقیقی معنوں میں کیا کوئی شخص بھی ایسی زندگی حاصل کر سکتا ہے۔ ہر آدمی یہ چاہتا ہے کہ اس کو اپنے حوصلوں کی تکمیل کا آخری حد تک موقع ملے، وہ اپنی ساری تمناؤں کو عمل کی صورت میں دیکھنا چاہتا ہے مگر اس محدود دنیا میں وہ ایسا نہیں کر سکتا۔ ہم جو کچھ چاہتے ہیں، یہ کائنات اس کے لئے بالکل ناسازگار معلوم ہوتی ہے وہ ہر چند قدم کے بعد ہمارا راستہ روک کر کھڑی ہو جاتی ہے، کائنات صرف ایک حد تک ہمارا ساتھ دیتی ہے، اس کے بعد ہم کو مایوس اور ناکام لوٹا دیتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا انسانی زندگی محض غلطی سے ایک ایسی کائنات میں بھٹک آئی ہے جو دراصل اس کے لئے نہیں بنائی گئی تھی اور جو بظاہر زندگی اور اس کے متعلقات سے بالکل بے پروا ہے۔ کیا ہمارے تمام جذبات وخیالات اور ہماری تمام

خواہشیں غیر حقیقی ہیں جن کا واقعی دنیا سے کوئی تعلق نہیں۔ ہمارے تمام بہترین تخیلات کائنات کے راستے سے ہٹے ہوئے ہیں اور ہمارے ذہنوں میں بالکل الل ٹپ طریقے سے پیدا ہوگئے ہیں۔ وہ تمام احساسات جن کو لے کر انسانی نسل پچھلے ہزاروں سال سے پیدا ہو رہی ہے اور جن کو اپنے سینہ میں لئے ہوئے وہ اس حال میں دفن ہو جاتی ہے کہ وہ انھیں حاصل نہ کرسکی، کیا ان احساسات کی کوئی منزل نہیں۔ کیا وہ انسانوں کے ذہن میں بس یونہی پیدا ہو رہے ہیں جن کے لئے نہ تو ماضی میں کوئی بنیاد موجود ہے اور نہ مستقبل میں ان کا کوئی مقام ہے۔

ساری کائنات میں صرف انسان ایک ایسا وجود ہے جو کل (Tomorrow) کا تصور رکھتا ہے۔ یہ صرف انسان کی خصوصیت ہے کہ وہ مستقبل کے بارہ میں سوچتا ہے اور اپنے آیندہ حالات کو بہتر بنانا چاہتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض جانور مثلاً چیونٹیاں خوراک جمع کرتی ہیں یا بیا گھونسلے بناتا ہے۔ مگر ان کا یہ عمل غیر شعوری طور پر محض عادتاً ہوتا ہے۔ ان کی عقل اس کا فیصلہ نہیں کرتی کہ انھیں خوراک جمع کر کے رکھنا چاہئے تاکہ کل ان کے کام آسکے یا ایسا گھر بنانا چاہیے جو موسموں کے ردوبدل میں تکلیف سے بچائے۔ انسان اور دوسری مخلوقات کا یہ فرق ظاہر کرتا ہے کہ انسان کو تمام دوسری چیزوں سے زیادہ موقع ملنا چاہیے، جانوروں کے لئے زندگی صرف آج کی زندگی ہے، وہ زندگی کا کوئی کل نہیں رکھتے، کیا اسی طرح انسانی زندگی کا بھی کوئی کل نہیں ہے۔ ایسا ہونا فطرت کے خلاف ہے، فردا کا تصور جو انسان میں پایا جاتا ہے اس کا صریح تقاضا ہے کہ انسان کی زندگی اس سے کہیں زیادہ بڑی ہو جتنی آج اسے حاصل ہے انسان "کل" چاہتا ہے مگر اس کو صرف "آج" دیا گیا ہے!

اسی طرح جب ہم سماجی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم کو ایک خلا کا زبردست احساس ہوتا ہے۔ ایک طرف مادی دنیا ہے جو اپنی جگہ پر بالکل مکمل نظر آتی ہے۔ وہ ایک متعین قانون میں جکڑی ہوئی ہے اور اس کی ہر چیز اپنے مقرر راستہ پر چلی جا رہی ہے۔ دوسرے لفظوں میں مادی دنیا ویسی ہی ہے جیسی کہ اسے ہونا چاہیے مگر انسانی دنیا کا حال اس سے مختلف ہے۔ یہاں صورتِ حال اس کے برعکس ہے جیسا کہ اسے ہونا چاہئے تھا۔

ہم صریح طور پر دیکھتے ہیں کہ ایک انسان دوسرے انسان پر ظلم کرتا ہے اور دونوں اس حال میں مرجاتے ہیں کہ ایک ظالم ہوتا ہے اور دوسرا مظلوم۔ کیا ظالم کو اس کے ظلم کی سزا اور مظلوم کو اس کی مظلومیت کا بدلہ دیئے بغیر دونوں کی زندگی کو مکمل کہا جا سکتا ہے۔ ایک شخص سچ بولتا ہے اور حق داروں کو ان کے حقوق ادا کرتا ہے جس کے نتیجہ میں اس کی زندگی مشکل کی زندگی بن جاتی ہے، دوسرا شخص جھوٹ اور فریب سے کام لیتا ہے اور جس کی جو چیز پاتا ہے ہڑپ کر لیتا ہے جس کے نتیجہ میں اس کی زندگی نہایت عیش و عشرت کی زندگی بن جاتی ہے۔ اگر یہ دنیا اسی حال میں ختم ہو جائے تو کیا دونوں انسانوں کے اس مختلف انجام کی کوئی توجیہ کی جا سکتی ہے۔ ایک قوم دوسری قوم پر ڈاکہ ڈالتی ہے اور اس کے وسائل و ذرائع پر قبضہ کر لیتی ہے مگر اس کے باوجود دنیا میں وہی نیک نام رہتی ہے کیونکہ اس کے پاس نشر و اشاعت کے ذرائع ہیں اور دبی ہوئی قوم کی حالت سے دنیا ناواقف رہتی ہے کیونکہ اس کی آہ کے دنیا کے کانوں تک پہونچنے کا کوئی ذریعہ نہیں، کیا ان دونوں کی صحیح حیثیت کبھی ظاہر نہیں ہوگی۔ دو اشخاص یا دو قوموں میں ایک مسئلہ پر اختلاف ہوتا ہے اور زبردست کش مکش تک نوبت پہونچ جاتی ہے۔ دونوں اپنے آپ کو برسرحق کہتے ہیں اور ایک دوسرے کو انتہائی برا ثابت کرتے ہیں مگر دنیا میں ان کے مقدمہ کا فیصلہ نہیں ہوتا، کیا ایسی کوئی عدالت نہیں ہے جو ان کے درمیان ٹھیک ٹھیک فیصلہ کر سکے۔

موجودہ دور کو ایٹمی دور کہا جاتا ہے لیکن اگر اس کو خودسری کا دور کہیں تو زیادہ صحیح ہوگا۔ آج کا انسان صرف اپنی رائے اور خواہش پر چلنا چاہتا ہے خواہ اس کی رائے اور خواہش کتنی ہی غلط کیوں نہ ہو۔ ہر شخص غلط کار ہے مگر ہر شخص گلے کی پوری قوت کے ساتھ اپنے کو صحیح ثابت کر رہا ہے۔ اخبارات میں لیڈروں اور حکمرانوں کے بیانات دیکھئے، ہر ایک انتہائی دیدہ دلیری کے ساتھ اپنے ظلم کو عین انصاف اور اپنی غلط کاریوں کو عین حق ثابت کرتا ہوا نظر آئے گا۔ کیا اس فریب کا پردہ کبھی چاک ہونے والا نہیں ہے۔

یہ صورت حال صریح طور پر ظاہر کر رہی ہے کہ یہ دنیا نامکمل ہے۔ اس کی تکمیل کے لئے ایک ایسی دنیا چاہئے جہاں ہر ایک کو اس کا صحیح مقام مل سکے۔

مادی دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ جہاں کوئی خلا ہے اس کو پُر کرنے کے اسباب موجود ہیں۔ مادی دنیا میں کہیں کوئی کمی نظر نہیں آتی۔ اس کے برعکس انسانی دنیا میں ایک زبردست خلا ہے۔ جس قدرت نے مادّی دنیا کو مکمل حالت میں ترقی دی ہے کیا اس کے پاس انسانی دنیا کا خلا پر کرنے کا کوئی سامان نہیں۔ ہمارا احساس بعض افعال کو اچھا اور بعض کو برا سمجھتا ہے۔ ہم کچھ باتوں کے متعلق چاہتے ہیں کہ وہ ہوں اور کچھ باتوں کو چاہتے ہیں کہ وہ نہ ہوں۔ مگر ہماری فطری خواہش کے علی الرّغم وہ سب کچھ یہاں ہو رہا ہے جس کو انسانی فطرت برا سمجھتی ہے، انسان کے اندر اس طرح کے احساس کی موجودگی یہ معنیٰ رکھتی ہے کہ کائنات کی تعمیر حق پر ہوئی ہے۔ یہاں باطل کے بجائے حق کو غالب آنا چاہیئے۔ پھر کیا حق ظاہر نہیں ہوگا۔ جو چیز مادی دنیا میں پوری ہو رہی ہے کیا وہ انسانی دنیا میں پوری نہیں ہوگی۔

یہی وہ سوالات ہیں جن کے مجموعہ کو میں نے اوپر "انسانیت کے انجام کی تلاش" کہا ہے۔ ایک شخص جب ان حالات کو دیکھتا ہے تو وہ سخت بے چینی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس کے اندر نہایت شدت سے یہ احساس ابھرتا ہے کہ زندگی اگر یہی ہے جو اس وقت نظر آرہی ہے تو یہ کس قدر لغو زندگی ہے۔ وہ ایک طرف دیکھتا ہے کہ انسانی زندگی کے لئے کائنات میں اس قدر اہتمام کیا گیا ہے گویا سب کچھ صرف اسی کے لئے ہے، دوسری طرف انسان کی زندگی اس قدر مختصر اور اتنی ناکام ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کو کس لئے پیدا کیا گیا ہے۔

اس سوال کے سلسلہ میں آج لوگوں کا رجحان عام طور پر یہ ہے کہ اس قسم کے جھنجھٹ میں پڑنا فضول ہے۔ یہ سب فلسفیانہ سوالات ہیں، اور حقیقت پسندی یہ ہے کہ زندگی کا جو لمحہ تمہیں حاصل ہے اس کو پُر مسرت بنانے کی کوشش کرو۔ آیندہ کیا ہوگا یا جو کچھ ہو رہا ہے وہ صحیح ہے یا غلط، اس کی فکر میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔

اس جواب کے بارہ میں کم از کم بات جو کہی جاسکتی ہے وہ یہ کہ جو لوگ اس انداز میں سوچتے ہیں انھوں نے ابھی انسانیت کے مقام کو نہیں پہچانا، وہ مجاز کو حقیقت سمجھ لینا چاہتے ہیں۔ واقعات انھیں ابدی زندگی کا راز معلوم کرنے کی دعوت دے رہے ہیں مگر وہ چند روزہ زندگی پر قانع ہو گئے ہیں۔ انسانی نفسیات کا تقاضا ہے

کہ اپنی امنگوں اور حوصلوں کی تکمیل کے لئے ایک وسیع تر دنیا کی تلاش کرو مگر یہ نادان روشنی کے بجائے اس کے سایہ کو کافی سمجھ رہے ہیں۔ کائنات پکار رہی ہے کہ یہ دنیا تمہارے لئے نامکمل ہے، دوسری مکمل دنیا کا کھوج لگاؤ۔ مگر ہمارا فیصلہ ہے کہ ہم اسی نامکمل دنیا میں اپنی زندگی کی عمارت تعمیر کریں گے، ہم کو مکمل دنیا کی ضرورت نہیں۔ حالات کا صریح اشارہ ہے کہ زندگی کا ایک انجام آنا چاہئے، مگر یہ لوگ صرف آغاز کو لے کر بیٹھ گئے ہیں اور انجام کی طرف سے آنکھیں بند کر لی ہیں۔ حالانکہ یہ اسی قسم کی ایک حماقت ہے جو شتر مرغ کے متعلق مشہور ہے۔ اگر فی الواقع زندگی کا کوئی انجام ہے تو وہ آکر رہے گا اور کسی کا اس سے غافل ہونا اس کو روکنے کا سبب نہیں بن سکتا۔ البتہ ایسے لوگوں کے حق میں وہ ناکامی کا فیصلہ ضرور کر سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ زندگی کو کل زندگی سمجھنا اور صرف آج کو پر مسرت بنانے کی کوشش کو اپنا مقصد بنا لینا بڑی کم ہمتی اور بے عقلی کی بات ہے۔ آدمی اگر اپنی زندگی اور کائنات پر تھوڑا سا بھی غور کرے تو اس نقطۂ نظر کی لغویت فوراً واضح ہو جاتی ہے ایسا فیصلہ وہی کر سکتا ہے جو حقیقتوں کی طرف سے آنکھیں بند کرلے اور بالکل بے سمجھی بوجھی زندگی گزارنا شروع کر دے۔

یہ ہیں وہ چند سوالات جو کائنات کو دیکھتے ہی نہایت شدت کے ساتھ ہمارے ذہن میں ابھرتے ہیں۔ اس کائنات کا ایک خالق ہونا چاہئے، مگر اس کے متعلق ہمیں کچھ نہیں معلوم۔ اس کا ایک چلانے والا اور اس کو سنبھالنے والا ہونا چاہئے، مگر ہم نہیں جانتے کہ وہ کون ہے۔ ہم کسی کے احسانات سے ڈھکے ہوئے ہیں اور مجسم شکر و سپاس بن کر اس ہستی کو ڈھونڈھنا چاہتے ہیں جس کے آگے اپنے عقیدت کے جذبات کو نثار کر سکیں، مگر ایسا کوئی وجود ہمیں نظر نہیں آتا۔ تاہم اس کائنات کے اندر انتہائی عجز اور بے بسی کے عالم میں ہیں، ہم کو ایک ایسی پناہ کی تلاش ہے جہاں پہونچ کر ہم اپنے آپ کو محفوظ تصور کر سکیں، مگر ایسی کوئی پناہ ہماری آنکھوں کے سامنے موجود نہیں ہے۔ پھر جب ہم اپنی زندگی اور اپنی عمر کو دیکھتے ہیں تو کائنات کا یہ تضاد ہم کو ناقابل فہم معلوم ہوتا ہے کہ کائنات کی عمر تو کھربوں سال ہو اور انسان جو کائنات کا خلاصہ ہے اس کی عمر

صرف چند سال۔ فطرت ہم کو بے شمار امنگوں اور حوصلوں سے معمور کرے مگر دنیا کے اندر اس کی تسکین کا سامان فراہم نہ کرے۔

پھر سب سے زیادہ سنگین تضاد وہ ہے جو مادی دنیا اور انسانی دنیا میں پایا جاتا ہے۔ مادی دنیا انتہائی طور پر مکمل ہے، اس میں کہیں خلا نظر نہیں آتا، مگر انسانی زندگی میں زبردست خلا ہے۔ اشرف المخلوقات کی حالت ساری مخلوق سے بدتر نظر آتی ہے۔ ہماری بدقسمتی کی انتہا یہ ہے کہ اگر پٹرول کا کوئی نیا چشمہ دریافت ہو یا بھیڑ بکریوں کی نسل بڑھے تو اس سے انسان خوش ہوتا ہے، مگر انسانی نسل کا اضافہ ہمارے لئے گوارہ نہیں۔ ہم اپنی مشکلوں سے اس قدر پریشان ہیں کہ انسان کی پیدائش کو روک دینا چاہتے ہیں۔

انسان کی نارسائی

یہ سوالات ہم کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں، وہ اندر سے بھی ابل رہے ہیں اور باہر سے بھی ہمیں گھیرے ہوئے ہیں، مگر ہمیں نہیں معلوم کہ ان کا جواب کیا ہے۔ یہ زندگی کی حقیقت معلوم کرنے کا سوال ہے، مگر کس قدر عجیب بات ہے کہ ہمیں زندگی تو مل گئی مگر اس کی حقیقت ہمیں نہیں بتائی گئی۔

اس حقیقت کی دریافت کے لئے جب ہم اپنی عقل اور اپنے تجربات کی طرف دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا صحیح اور قطعی جواب معلوم کرنا ہماری عقل اور ہمارے تجربہ کے بس سے باہر ہے۔ اس سلسلہ میں اب تک ہم نے جو رائیں قائم کی ہیں وہ اٹکل سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتیں۔ جس طرح ہماری نظر کا دائرہ محدود ہے اور ہم ایک مخصوص جسامت سے چھوٹی چیز کا مشاہدہ نہیں کر سکتے اور ایک مخصوص فاصلے سے آگے کے اجسام کو نہیں دیکھ سکتے، اسی طرح کائنات کے متعلق ہمارا علم بھی ایک تنگ دائرہ میں محدود ہے جس کے آگے یا پیچھے کی ہمیں کوئی خبر نہیں۔ ہمارا علم نامکمل ہے، ہمارے حواس خمسہ ناقص ہیں۔ ہم حقیقت کو نہیں دیکھ سکتے۔ میدہ اور کالک کو اگر ملایا جائے تو بھورے خاکستری رنگ کا ایک سفوف سا بن جاتا ہے، لیکن اس سفوف کا باریک کیڑا جو سفوف کے ذروں ہی کے برابر ہوتا ہے اور صرف خوردبین کی مدد سے دیکھا جا سکتا ہے وہ اس کو کچھ سیاہ اور کچھ سفید رنگ کی چٹان سمجھتا ہے

اس کے مشاہدہ کے پیمانہ میں خاکستری سفوف کوئی چیز نہیں۔

نوعِ انسانی کی زندگی اس زمانہ کے مقابلہ میں جب کہ یہ کرۂ ارض وجود میں آیا اس قدر مختصر ہے کہ کسی شمار میں نہیں آتی، اور خود کرۂ ارض کائنات کے اتھاہ سمندر میں ایک قطرہ کے برابر بھی نہیں۔ ایسی صورت میں انسان کائنات کی حقیقت کے بارہ میں جو خیال آرائی کرتا ہے، اس کو اندھیرے میں ٹٹولنے سے زیادہ اور کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ ہماری انتہائی لاعلمی فوراً ظاہر ہوجاتی ہے جب ہم کائنات کی وسعت کا تصور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اگر آپ اس بات کو سامنے رکھیں کہ آفتاب اسیّ کھرب سال سے موجود ہے اس زمین کی عمر جس پر ہم بستے ہیں دو ارب سال ہے، اور زمین پر زندگی کے آثار نمایاں ہوئے تین کرور سال گذر چلے ہیں مگر اس کے مقابلہ میں زمین پر ذی عقل انسان کی تاریخ چند ہزار سال سے زیادہ نہیں تو یہ حقیقت عیاں ہوجاتی ہے کہ چند ہزار سال کا زمانہ جس میں انسان نے اپنی معلومات فراہم کی ہیں، اس طویل زمانہ کا ایک بہت حقیر جزو ہے جو کہ دراصل کائنات کے اسرار کو معلوم کرنے کے لئے درکار ہے۔ کائنات کے بے حد طویل ماضی اور نامعلوم مستقبل کے درمیان انسانی زندگی محض ایک لمحہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہمارا وجود ایک نہایت حقیر قسم کا درمیانی وجود ہے جس کے آگے اور پیچھے کی ہمیں کوئی خبر نہیں۔ ہماری عقل کو عاجزی کے ساتھ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اس کائنات کی وسعت لامحدود ہے اور اس کو سمجھنے کے لئے ہماری عقل اور ہمارا تجربہ بالکل ناکافی ہیں، ہم اپنی محدود صلاحیتوں کے ذریعہ کبھی بھی اس کو سمجھ نہیں سکتے۔ اب تک کی کوششوں کی ناکامی اس کو ثابت کرنے کے لئے بالکل کافی ہے

اس طرح ہمارا علم اور ہمارا مطالعہ ہم کو ایک ایسے مقام پر لاکر چھوڑ دیتے ہیں۔ جہاں ہمارے سامنے بہت سے سوالات ہیں، ایسے سوالات جو لازمی طور پر اپنا جواب چاہتے ہیں۔ جن کے بغیر انسانی زندگی بالکل لغو اور بے کار نظر آتی ہے۔ مگر جب ہم ان پر سوچنے بیٹھتے ہیں تو ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ ہم اپنے ذہن سے ان کا جواب معلوم نہیں کرسکتے۔ ہم کو وہ آنکھ ہی نہیں ملی جس سے حقیقت کا مشاہدہ کیا جاسکے۔ اور وہ ذہن ہمیں حاصل نہیں ہے جو براہ راست حقیقت کا ادراک کرسکے۔

پیغمبر کی ضرورت

اس موقع پر ایک شخص ہمارے سامنے آتا ہے اور کہتا ہے کہ جس حقیقت کو تم معلوم کرنا چاہتے ہو، اس کا علم مجھے دیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ:

"اس کائنات کا ایک خدا ہے جس نے سارے عالم کو بنایا ہے، اور اپنی غیر معمولی قوتوں کے ذریعہ اس کا انتظام کر رہا ہے۔ جو چیزیں تمہیں حاصل ہیں وہ سب اسی نے تمہیں دی ہیں اور سارے معاملات کا اختیار اسی کو ہے۔ یہ جو تم دیکھ رہے ہو کہ مادی دنیا کے اندر کوئی تضاد نہیں، وہ ٹھیک ٹھیک اپنے فرائض انجام دے رہی ہے اور اس کے برعکس انسانی دنیا ادھوری نظر آتی ہے، یہاں زبردست خلفشار برپا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کو آزادی دے کر اسے آزمایا جا رہا ہے۔ تمہارا مالک یہ چاہتا ہے کہ اس کا قانون جو مادی دنیا میں براہ راست نافذ ہو رہا ہے اس کو انسان اپنی زندگی میں خود سے اختیار کرے یہی وجود کائنات کا خالق ہے، وہی اس کا مدبر اور منتظم ہے، وہی تمہارے جذباتِ شکر کا مستحق ہے اور وہی ہے جو تم کو پناہ دے سکتا ہے۔ اس نے تمہارے لئے ایک لامحدود زندگی کا انتظام کر رکھا ہے جو موت کے بعد آنے والی ہے، جہاں تمہاری امنگوں کی تسکین ہو سکے گی، جہاں حق و باطل الگ الگ کر دیئے جائیں گے اور نیکوں کو ان کی نیکی کا اور بروں کو ان کی برائی کا بدلہ دیا جائے گا۔ اس نے میرے ذریعہ سے تمہارے پاس اپنی کتاب بھیجی ہے جس کا نام قرآن ہے۔ جو اس کو مانے گا وہ کامیاب ہوگا اور جو اس کو نہ مانے گا ذلیل کر دیا جائے گا۔"

یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی آواز ہے جو چودہ سو برس پہلے عرب کے ریگستان سے بلند ہوئی تھی اور آج بھی ہم کو پکار رہی ہے۔ اس کا پیغام ہے کہ اگر حقیقت کو معلوم کرنا چاہتے ہو تو میری آواز پر کان لگاؤ اور میں جو کچھ کہتا ہوں اس پر غور کرو۔

کیا یہ آواز حقیقت کی واقعی تعبیر ہے، کیا ہمیں اس پر ایمان لانا چاہئے۔ وہ کون سی بنیادیں ہیں جن کی روشنی میں اس کے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ کیا جائے گا۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس حقیقت کو وہ اس وقت تسلیم کریں گے جب کہ وہ انھیں نظر آئے۔ وہ حقیقت کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتے ہیں۔ مگر یہ مطالبہ

بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص فلکیات کا مطالعہ ریاضی کے بغیر کرنے کی کوشش کرے اور کہے کہ وہ فلکیاتی سائنس کی صرف ان ہی دریافتوں کو تسلیم کرے گا جو کھلی آنکھوں سے اسے نظر آتی ہوں، ریاضیات کی دلیل اس کے نزدیک قابل قبول نہیں ہے، یہ مطالبہ ظاہر کرتا ہے کہ آدمی کو اپنی قوتوں کا صحیح علم نہیں ہے۔

انسان کے پاس مشاہدہ کی جو قوتیں ہیں وہ نہایت محدود ہیں، حقیقت ہمارے لئے ایک ناقابل مشاہدہ چیز ہے۔ ہم اسے محسوس تو کر سکتے ہیں مگر اسے دیکھ نہیں سکتے۔ ایک زمانہ میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ دنیا چار چیزوں سے مل کر بنی ہے۔ "آتش و آب و خاک و باد"۔ دوسرے لفظوں میں قدیم انسان اس غلط فہمی میں مبتلا تھا کہ حقیقت ایک ایسی چیز ہے جسے دیکھا جا سکتا ہے، مگر جدید تحقیقات نے اس کی غلطی واضح کر دی ہے۔ اب ہم جانتے ہیں کہ دنیا کی تمام چیزیں اپنے آخری تجزیہ میں ایٹم کے باریک ترین ذرات پر مشتمل ہیں۔ ایٹم ایک اوسط درجہ کے سیب سے اتنا ہی چھوٹا ہوتا ہے جتنا کہ سیب ہماری زمین سے۔ یہ ایٹم ایک طرح کا نظام شمسی ہے جس کا ایک مرکز ہے، اس مرکز میں پروٹان اور نیوٹران ہوتے ہیں اور اس کے چاروں طرف الکٹران (برقیے) مختلف مداروں میں اسی طرح حرکت کرتے ہیں جیسے سورج کے گرد اس کے تابع سیارے حرکت کرتے ہیں۔ ایک برقیہ جس کا قطر سینٹی میٹر کا پانچ ہزار کروڑواں حصہ ہو اور جو اپنے مرکز کے چاروں طرف ایک سکنڈ میں کروڑوں مرتبہ چکر کاٹتا ہو اس کے تصور کی کوشش کرنا سعی لاحاصل ہے۔ جب کہ ہمیں یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ اندرونی عالموں کی آخری حد ہے۔ ممکن ہے ان عالموں کے اندر ان سے بھی چھوٹے عالم ہوں۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہماری مشاہدہ کی قوت کس قدر کمزور ہے، پھر سوال یہ ہے کہ پروٹان اور نیوٹران کے وہ انتہائی چھوٹے ذرے جو باہم مل کر مرکز بناتے ہیں وہ کس طرح قائم ہیں۔ آخر یہ پروٹان اور نیوٹران مرکز سے باہر کیوں نہیں نکل پڑتے۔ وہ کیا چیز ہے جو انھیں ایک دوسرے سے باندھے ہوئے ہے۔ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ ان مادی ذرات کے درمیان ایک توانائی موجود ہے اور یہی توانائی مرکز کے برقی اور غیر برقی ذرات کو آپس میں جکڑے ہوئے ہے۔ اس کو طاقت یکجائی

(Binding Energy) کا نام دیا گیا ہے۔ گویا مادہ اپنے آخری تجزیہ میں توانائی ہے، میں پوچھتا ہوں، کیا یہ توانائی قابل مشاہدہ چیز ہے۔ کیا کسی بھی خوردبین کے ذریعہ اسے دیکھا جا سکتا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جدید سائنس نے خود یہ تسلیم کر لیا ہے کہ حقیقت اپنی آخری صورت میں ایک ناقابل مشاہدہ چیز ہے اس کو انسانی آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔

اب اگر رسول کی بات کو ماننے کے لئے ہم یہ شرط لگائیں کہ وہ جن حقیقتوں کی خبر دے رہا ہے وہ ہمیں چھونے اور دیکھنے کو ملنی چاہئیں تب ہم اسے مانیں گے تو یہ ایک نہایت نامعقول بات ہوگی۔ یہ ایسی ہی بات ہوگی جیسے تاریخ ہند کا کوئی طالب علم ایسٹ انڈیا کمپنی کے حالات کا مطالعہ کرتے ہوئے اپنے استاد سے کہے کہ کمپنی کے تمام کردار کو میرے سامنے لاکر کھڑا کر دو اور وہ میرے سامنے تمام گزرے ہوئے واقعات کو دہرائیں، تب میں تمہاری تاریخ کو تسلیم کروں گا۔

پھر وہ کون سی بنیادیں ہیں جن کی روشنی میں دیکھ کر ہم یہ فیصلہ کریں کہ یہ دعوت صحیح ہے یا غلط، اور ہم کو اسے قبول کرنا چاہئے یا نہیں۔ میرے نزدیک اس دعوت کو جانچنے کے تین خاص پہلو ہیں۔ اول یہ کہ اس کی توجیہ حقیقت سے کتنی مطابقت رکھتی ہے۔ دوسرے یہ کہ زندگی کے انجام کے بارہ میں اس کا دعویٰ محض دعویٰ ہے یا اس کی کوئی دلیل بھی اس کے یہاں ملتی ہے۔ اور تیسرے یہ کہ اس کے پیش کئے ہوئے کلام میں کیا ایسی کوئی نمایاں خصوصیت پائی جارہی ہے کہ اس کو خدا کا کلام کہا جا سکے۔ ان تینوں پہلوؤں کے اعتبار سے جب ہم رسول کے کام کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک پر وہ نہایت کامیابی کے ساتھ پورا اتر رہا ہے۔

۱۔ رسول نے کائنات کی جو توجیہ کی ہے اس میں ہماری تمام پیچیدگیوں کا حل موجود ہے۔ ہمارے اندر اور ہمارے باہر جتنے سوالات پیدا ہوتے ہیں ان سب کا وہ بہترین جواب ہے۔

۲۔ زندگی کے انجام کے بارہ میں اس کا جو دعویٰ ہے اس کے لئے وہ ایک قطعی دلیل بھی اپنے پاس رکھتا ہے۔ وہ یہ کہ موجودہ زندگی میں وہ اس انجام کا

ایک نمونہ ہمیں دکھا دیتا ہے جس کو بعد کی زندگی میں آنے کی وہ خبر دے رہا ہے۔
۳۔ وہ جس کلام کو خدا کا کلام کہتا ہے اس کے اندر اتنی غیر معمولی خصوصیات پائی جاتی ہیں کہ ماننا پڑتا ہے کہ یقیناً یہ ایک فوق الانسانی طاقت کا کلام ہے۔ کسی انسان کا کلام ایسا نہیں ہو سکتا۔
آئیے اب ان تینوں پہلوؤں سے رسول کی دعوت کا جائزہ لیں۔

پیغمبر کی صداقت

۱۔ اس کی پہلی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ انسانی نفسیات کے عین مطابق ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان کی پیدائش جس فطرت پر ہوئی ہے وہی فطرت اس توجیہ کی بھی ہے۔ اس توجیہ کی بنیاد ایک خدا کے وجود پر رکھی گئی ہے، اور ایک خدا کا شعور انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ اس کے دو نہایت مضبوط قرینے ہیں۔ ایک یہ کہ انسانی تاریخ کے تمام معلوم زمانوں میں انسانوں کی اکثریت بلکہ تقریباً ان کی تمام تعداد نے خدا کے وجود کو تسلیم کیا ہے۔ انسان پر کبھی بھی ایسا کوئی دور نہیں گزرا ہے جب اس کی اکثریت خدا کے شعور سے خالی رہی ہو۔ قدیم ترین زمانوں سے لے کر آج تک انسانی تاریخ کی متفقہ شہادت یہی ہے کہ خدا کا شعور انسانی فطرت کا نہایت طاقت ور شعور رہے۔ دوسرا قرینہ یہ ہے کہ انسان پر جب کوئی نازک وقت آتا ہے تو اس کا دل بے اختیار خدا کو پکار اٹھتا ہے، جہاں کوئی سہارا نظر نہیں آتا، وہاں وہ خدا کا سہارا ڈھونڈتا ہے۔ جاہل ہو یا عالم۔ خدا پرست ہو یا ملحد، روشن خیال ہو یا تاریک خیال جب بھی اس پر کوئی ایسا وقت گزرتا ہے جہاں عام انسانی قوتیں جواب دیتی ہوئی نظر آتی ہیں تو وہ ایک ایسی ہستی کو پکارتا ہے جو تمام طاقتوں سے بڑھ کر طاقتور ہے اور جو تمام طاقتوں کا خزانہ ہے۔ انسان اپنے نازک ترین لمحات میں خدا کو یاد کرنے پر مجبور ہے۔ اس کی ایک دلچسپ مثال ہمیں سٹالن کی زندگی میں ملتی ہے جس کا ذکر مسٹر چرچل نے دوسری جنگ عظیم کے حالات کے متعلق اپنی کتاب کی چوتھی جلد صفحہ ۴۳۳ میں کیا ہے۔ ۱۹۴۲ء کے نازک حالات میں جب کہ ہٹلر سارے یورپ کے لئے خطرہ بنا ہوا تھا، چرچل نے ماسکو کا

سفر کیا تھا، اس موقع پر چرچل نے سٹالن کو اتحادی فوجی کارروائی کے متعلق اپنی اسکیم کی تفصیلات بتائیں۔ چرچل کا بیان ہے کہ اسکیم کی تشریح کے ایک خاص مرحلہ پہ جب کہ سٹالن کی دلچسپیاں اس سے بہت بڑھ چکی تھیں، اس کی زبان سے نکلا خدا اس مہم کو کامیاب کرے"۔

May God prosper this undertaking

اسی کے ساتھ نبی کی آواز کی یہ خصوصیت بھی ہے کہ وہ ان تمام سوالات کی مکمل توجیہ ہے جو انسان معلوم کرنا چاہتا ہے اور جو کائنات کے مطالعہ سے ہمارے ذہنوں میں ابھرتے ہیں۔ کائنات کے مطالعہ نے ہمیں اس نتیجہ پر پہونچایا تھا کہ یہ محض اتفاق سے نہیں پیدا ہو سکتی، ضرور اس کا کوئی پیدا کرنے والا ہونا چاہئے۔ اس توجیہ میں اس سوال کا جواب موجود ہے۔ ہم کو نظر آرہا تھا کہ کائنات محض ایک مادی مشین نہیں ہے اس کے پیچھے کوئی غیر معمولی ذہن ہونا چاہئے جو اسے چلا رہا ہو۔ اس توجیہ میں اس سوال کا جواب بھی موجود ہے۔ ہم کو اپنے محسن کی تلاش تھی اور ایک ایسی ہستی کی تلاش تھی جو ہمارا سہارا بن سکے۔ اس توجیہ میں اس کا جواب بھی موجود ہے۔ ہم کو یہ بات بہت عجیب معلوم ہو رہی تھی کہ انسانی زندگی اتنی مختصر کیوں ہے۔ ہم اس کو لامحدود دیکھنا چاہتے تھے۔ ہم اپنے لئے ایک ایسے وسیع میدان کی تلاش میں تھے جہاں ہماری امنگوں کی تکمیل ہو سکے۔ اس توجیہ میں اس کا جواب بھی موجود ہے۔ پھر انسانی حالات کا شدید تقاضا تھا کہ حق کا حق ہونا اور باطل کا باطل ہونا واضح ہو اور اچھے اور برے الگ الگ کر دئے جائیں، ہر ایک کو اس کا صحیح مقام دیا جائے۔ اس سوال کا جواب بھی اس توجیہ میں موجود ہے۔ غرض زندگی سے متعلق سارے سوالات کا مکمل جواب ہے اور اتنا بہتر جواب ہے کہ اس سے بہتر جواب کا ہم تصور نہیں کر سکتے۔ اس سے وہ سارے سوالات حل ہو جاتے ہیں جو کائنات کے مطالعہ سے ہمارے ذہن میں پیدا ہوئے تھے۔

۲۔ اس کی دعوت کی دوسری نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ زندگی کے انجام کے بارہ میں وہ جو نظریہ پیش کرتا ہے اس کا ایک واقعاتی نمونہ خود اپنی زندگی میں ہمیں دکھا دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دنیا اسی طرح ظالم اور مظلوم کو لئے ہوئے ختم نہیں ہو جائیگی

بلکہ اس کے انجام پر کائنات کا رب ظاہر ہوگا اور سچوں اور جھوٹوں کو ایک دوسرے سے الگ الگ کر دے گا، اس دن کے آنے میں جو دیر ہے وہ صرف اس مہلتِ کار کے ختم ہونے کی ہے جو تمہارے لئے مقدر ہے۔

یہ بات وہ صرف کہہ کر نہیں چھوڑ دیتا، بلکہ اسی کے ساتھ اس کا دعویٰ یہ بھی ہے کہ میں جو کچھ کہتا ہوں اس کے صحیح ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ اس عدالت کا ایک نمونہ مالک کائنات میرے ذریعہ سے اسی دنیا میں تم کو دکھائے گا۔ میرے ذریعہ سے وہ حق کو غالب اور باطل کو مغلوب کرے گا، اپنے فرماں برداروں کو عزت دے گا اور اپنے نافرمانوں کو ذلیل کرکے انھیں عذاب میں مبتلا کرے گا۔ یہ واقعہ بہرحال ظہور میں آئے گا خواہ دنیا کے لوگ کتنی ہی مخالفت کریں اور ساری طاقت اس کے مٹانے پر لگا دیں جس طرح آخرت کا ہونا قطعی طور پر مقدر ہے اور کوئی اسے روک نہیں سکتا۔ اسی طرح میری زندگی میں اس کا نمونہ دکھایا جانا بھی لازمی ہے، یہ ایک نشان ہوگا آنے والے دن کا اور یہ دلیل ہوگی اس بات کی کہ کائنات کی تعمیر عدل پر ہوئی ہے اور یہ کہ میں جس طاقت کا نمائندہ ہوں وہ ایک ایسی طاقت ہے جس کی طاقت سب پر بالا ہے یہ طاقت ایک روز تم کو اپنے سامنے کھڑا کرکے تمام اگلے پچھلے انسانوں کا فیصلہ کرے گی۔

یہ چیلنج وہ اس وقت دیتا ہے جب کہ وہ تنہا ہے، پوری قوم اس کی دشمن ہوگئی ہے، خود اپنا ملک اس کو جگہ دینے کے لئے تیار نہیں، اس کے قریب ترین اعزا نے بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیا ہے، اس کے پاس مادی وسائل و ذرائع میں سے کچھ بھی نہیں۔ ایسا ایک شخص پورے یقین کے ساتھ اعلان کرتا ہے کہ میں غالب ہوں گا اور میرے ذریعہ سے خدا کی عدالت زمین پر قائم ہوگی۔ سننے والے اس کا مذاق اڑاتے ہیں مگر وہ نہایت سنجیدگی کے ساتھ اپنا کام کرتا چلا جارہا ہے ملک کی اکثریت اس کے قتل کا فیصلہ کرتی ہے، اس کی معاشیات تباہ کر دیتی ہے، اس کو جلا وطنی پر مجبور کرتی ہے۔ اس کو مٹانے پر اپنا سارا زور صرف کر دیتی ہے، مگر اس کے مقابلہ میں یہ سب کچھ بے اثر ثابت ہوتا ہے۔ اگرچہ بہت تھوڑے لوگ اس کا ساتھ دیتے ہیں، ایک طرف معمولی اقلیت ہوتی ہے اور دوسری طرف زبردست

اکثریت۔ ایک طرف سازوسامان ہوتا ہے اور دوسری طرف بے سروسامانی۔ ایک طرف ملکی باشندوں اور ہمسایہ قوموں کی حمایت ہوتی ہے اور دوسری طرف اپنوں اور غیروں کی متفقہ مخالفت۔ حالات کی انتہائی ناسازگاری سے اس کے ساتھی اکثر گھبرا اٹھتے ہیں مگر وہ ہر بار یہی کہتا ہے کہ انتظار کرو خدا کا فیصلہ آکر رہے گا، اس کو کوئی طاقت روک نہیں سکتی۔

اس کے چیلنج پر چوتھائی صدی بھی گزرنے نہیں پاتی کہ وہ مکمل شکل میں پورا ہو جاتا ہے اور تاریخ میں اپنی نوعیت کا واحد واقعہ ظہور میں آتا ہے کہ ایک شخص نے جن دعووں کے ساتھ اپنے کام کا آغاز کیا تھا ٹھیک اسی شکل میں اس کا دعویٰ پورا ہوا اور اس کے مخالفین اس میں کوئی کمی بیشی نہ کر سکے۔ حق اور باطل الگ الگ ہو گیا۔ خدا کے فرماں برداروں کو عزت اور غلبہ حاصل ہوا، اور خدا کے نافرمانوں کا زور توڑ کر انھیں محکوم بنا دیا گیا۔

اس طرح اس دعوت نے انسانوں کے لئے جس انجام کی خبر دی تھی اس کا ایک نمونہ دنیا میں قائم کر دیا گیا جو قیامت تک کے لئے عبرت کا نشان ہے، اس نمونہ کی تکمیل آخرت میں ہوگی جب سارے انسانوں کو خدا کی عدالت میں حاضر کر کے ان کا آخری فیصلہ کیا جائے گا۔

۳۔ اس شخص کے دعوے کے برحق ہونے کا تیسرا ثبوت وہ کلام ہے جس کو وہ کلام الٰہی کہہ کر پیش کرتا ہے۔ اس کلام کے اوپر کتنی ہی صدیاں گذر چکی ہیں مگر اس کی عظمت، اس کی سچائی اور حقیقت کے بارہ میں اس کے بیان کا ایک حرف بھی غلط ثابت نہ ہو سکا جب کہ کوئی بھی انسانی کتاب ایسی نہیں ہے جو ان نقائص سے پاک ہو۔

دوسرے لفظوں میں قرآن بذات خود اس بات کی دلیل ہے کہ وہ خدا کی کتاب ہے، اس کے بہت سے پہلو ہیں مگر میں یہاں صرف تین پہلوؤں کا ذکر کروں گا، ایک اس کا غیر معمولی انداز بیان، دوسرے اس کے معانی کا تضاد سے پاک ہونا، تیسرے اس کی ابدیت۔

قرآن اپنی دلیل آپ

۱۔ قرآن ایک غیر معمولی کلام ہے۔ اس کو پڑھتے ہوئے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مصنف ایک ایسے بلند مقام سے بول رہا ہے جو کسی بھی انسان کو حاصل نہیں۔ اس کی عبارتوں کا شکوہ، اس کی بے پناہ روانی اور اس کا فیصلہ کن انداز بیان اتنا حیرت انگیز طور پر انسانی کلام سے مختلف ہے کہ صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ مالک کائنات کی آواز ہے کسی انسان کی آواز نہیں۔ اس کا پر یقین اور باعظمت کلام خود ہی بول رہا ہے کہ یہ خدا کی کتاب ہے جس میں خدا اپنے بندوں سے مخاطب ہوا ہے۔ قرآن میں کائنات کی حقیقت بتائی گئی ہے۔ انسان کے انجام کی خبر دی گئی ہے اور زندگی سے متعلق تمام کھلے اور چھپے حالات پر گفتگو کی گئی ہے۔ مگر یہ سب کچھ اس قدر قطعی انداز میں بیان ہوا ہے کہ واقعہ کا اظہار واقعہ کا مشاہدہ معلوم ہونے لگتا ہے۔ قرآن کو پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے گویا آدمی کو حقیقت کا علم نہیں دیا جا رہا ہے بلکہ اس کو حقیقت کے سامنے لے جاکر کھڑا کر دیا گیا ہے۔ وہ واقعہ کو کتاب کے صفحات میں نہیں پڑھ رہا ہے بلکہ اسکرین کے اوپر اس کو اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ کلام کی یہ قطعیت صاف ظاہر کر رہی ہے کہ یہ ایک ایسی ہستی کا کلام ہے جس کو حقیقتوں کا براہ راست علم ہے۔ کوئی انسان جو حقیقتوں کا ذاتی علم نہ رکھتا ہو، وہ اپنے کلام میں ہرگز ایسا زور پیدا نہیں کرسکتا۔

یہاں میں نمونہ کے طور پر قرآن کی ایک چھوٹی سی سورت نقل کروں گا۔

إِذَا السَّمَاءُ انْفَطَرَتْ ۝	جب آسمان پھٹ جائے گا،
وَإِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ ۝	جب ستارے بکھر جائیں گے،
وَإِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ ۝	جب دریا ابل پڑیں گے،
وَإِذَا الْقُبُورُ بُعْثِرَتْ ۝	جب قبریں الٹ دی جائیں گی،
عَلِمَتْ نَفْسٌ مَا قَدَّمَتْ	اس دن ہر شخص جان لے گا جو
وَأَخَّرَتْ ۝ يَا أَيُّهَا	اس نے آگے بھیجا اور جو اس نے پیچھے
الْإِنْسَانُ مَا غَرَّكَ	چھوڑا اے انسان تجھکو خدائے عظیم
بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ	کے بارہ میں کس چیز نے دھوکے

الَّذِي خَلَقَكَ فَسَوَّاكَ
فَعَدَلَكَ فِي أَيِّ صُورَةٍ مَا شَاءَ
رَكَّبَكَ ۝ كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُونَ
بِالدِّينِ ۝ وَإِنَّ عَلَيْكُمْ
لَحَافِظِينَ ۝ كِرَامًا كَاتِبِينَ
يَعْلَمُونَ مَا تَفْعَلُونَ ۝
إِنَّ الْأَبْرَارَ لَفِي نَعِيمٍ ۝ وَإِنَّ
الْفُجَّارَ لَفِي جَحِيمٍ ۝ يَصْلَوْنَهَا
يَوْمَ الدِّينِ ۝ وَمَا هُمْ عَنْهَا
بِغَائِبِينَ ۝ وَمَا أَدْرَاكَ مَا
يَوْمُ الدِّينِ ۝ ثُمَّ مَا أَدْرَاكَ
مَا يَوْمُ الدِّينِ ۝ يَوْمَ لَا تَمْلِكُ
نَفْسٌ لِنَفْسٍ شَيْئًا ط
وَالْأَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِلَّهِ ۝

میں ڈال رکھا ہے۔ جس نے تجھے خلق کیا
تیرا تسویہ فرمایا اور پھر مناسبت قائم کی۔
اس نے جیسا چاہا ویسا تم کو بنایا، نہیں
بلکہ تم فیصلہ کے دن کا انکار کرتے ہو۔
حالاں کہ تمہارے اوپر نگہبان مقرر ہیں
صحیح صحیح لکھنے والے۔ وہ جانتے ہیں جو تم
کرتے ہو۔ یقیناً اچھے لوگوں کے لئے نعمتیں
ہیں اور یقیناً برے لوگوں کے لئے جہنم
ہے۔ وہ فیصلہ کے روز اس میں ڈالے
جائیں گے اور وہ ہرگز اس سے بھاگ
نہیں سکتے اور کیا تم جانتے ہو کہ فیصلہ
کا دن کیا ہے پھر کیا تم جانتے ہو کہ فیصلہ
کا دن کیا ہے وہ ایک ایسا دن ہے جب
کہ کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے لئے
کچھ نہ کر سکے گا اور اس دن اقتدار صرف خدا کے لئے ہوگا

کس قدر یقین سے بھرا ہوا ہے یہ کلام جس میں زندگی کی ابتدا اور انتہا سب کچھ بیان کر دی گئی ہے۔ کوئی بھی انسانی کتاب جو زندگی اور کائنات کے موضوع پر لکھی گئی ہو، اس یقین کی مثال پیش نہیں کر سکتی۔ سیکڑوں سال سے انسان کائنات کی حقیقت پر غور کر رہا ہے، بڑے بڑے فلسفی اور سائنس داں پیدا ہوئے، مگر کوئی اس یقین کے ساتھ بولنے کی جرأت نہ کر سکا۔ سائنس آج بھی یہ تسلیم کرتی ہے کہ وہ کسی قطعی اور صحیح علم سے ابھی بہت دور ہے جب کہ قرآن اس قدر یقین کے ساتھ بات کہتا ہے گویا وہ علم کا احاطہ کئے ہوئے ہے اور حقیقت سے آخری حد تک واقف ہے۔

۲۔ قرآن کے کلام الٰہی ہونے کی دوسری دلیل یہ ہے کہ اس نے مابعد الطبیعی حقائق سے لے کر تمدنی مسائل تک تمام اہم امور پر گفتگو کی ہے مگر کہیں بھی اس کے بیانات میں تضاد نہیں پایا جاتا۔ اس کلام کے اوپر تقریباً ڈیڑھ ہزار برس پورے

ہو رہے ہیں۔ اس دوران میں بہت سی نئی نئی باتیں انسان کو معلوم ہوئی ہیں مگر اس کی باتوں میں اب بھی کوئی تضاد ظاہر نہ ہوسکا، حالاں کہ انسانوں میں سے کسی ایک فلسفی کا بھی اس حیثیت سے نام نہیں لیا جاسکتا کہ اس کا کلام تضاد اور اختلاف سے پاک ہے۔ اس دوران میں ہزاروں فلسفی پیدا ہوئے جنہوں نے اپنی عقل سے زندگی اور کائنات کی توجیہ کرنے کی کوشش کی مگر بہت جلد ان کے کلام کا تضاد ظاہر ہوگیا اور زمانہ نے انھیں رد کر دیا۔

کسی کلام کا تضاد سے پاک ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ حقیقت سے کلی مطابقت رکھتا ہے۔ جو شخص حقیقتوں کا علم نہ رکھتا ہو یا صرف جزئی علم اسے حاصل ہو وہ جب بھی حقیقت کو بیان کرنے بیٹھے گا لازمی طور پر تضادات کا شکار ہو جائے گا۔ وہ ایک پہلو کی تشریح کرتے ہوئے دوسرے پہلو کی رعایت نہ کرسکے گا۔ وہ ایک رخ کو کھولے گا تو دوسرے رخ کو بند کر دے گا۔ زندگی اور کائنات کی توجیہ کا سوال ایک ہمہ گیر سوال ہے۔ اس کے لئے ساری حقیقتوں کا علم ہونا ضروری ہے۔ اور چونکہ انسان اپنی محدود صلاحیتوں کی بنا پر ساری حقیقتوں کا علم حاصل نہیں کرسکتا۔ اس لئے وہ سارے پہلوؤں کی رعایت بھی نہیں کرسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کے بنائے ہوئے فلسفوں میں تضاد کا پایا جانا لازمی ہے۔ قرآن کی یہ خصوصیت کہ وہ اس قسم کے تضادات سے پاک ہے اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ وہ حقیقت کی صحیح ترین تعبیر ہے، اس کے سوا تمام تعبیریں غلط ہیں، اس واقعہ کو میں مثال کے ذریعہ واضح کروں گا۔

۱۔ زندگی کے موضوع پر جو کتاب لکھی جائے اس کا ایک ضروری باب زندگی کے فرائض متعین کرنا ہے۔ یہ فرائض متعین کرنے میں ضروری ہے کہ ان کے مختلف پہلوؤں کی ٹھیک ٹھیک رعایت کی جائے۔ ایسا نہ ہو کہ ایک پہلو سے کوئی ایسا حکم دیا جائے جو دوسرے پہلو سے ٹکراتا ہو۔ مثلاً عورت اور مرد کی حیثیت متعین کرنا تمدنی زندگی کا ایک اہم مسئلہ ہے۔ آج کے ترقی یافتہ دور نے یہ قرار دیا ہے کہ عورت اور مرد کے درمیان مساوات ہونی چاہئے اور زندگی کے ہر شعبہ میں دونوں کو یکساں طور پر کام کرنے کا موقع دینا چاہئے، مگر یہاں انسانی ساخت کا یہ تمدنی اصول ایک نہایت اہم صورتِ واقعی سے ٹکرا رہا ہے۔ یعنی اس حقیقت سے کہ حیاتیات (Biology) کے اعتبار سے دونوں صنفوں کے درمیان مساوات نہیں، اور یہ ممکن نہیں کہ دونوں یکساں طور پر

زندگی کا بوجھ اٹھا سکیں۔ اس کے برعکس قرآن نے تمدنی زندگی میں عورت اور مرد کا جو مقام متعین کیا ہے وہ دونوں کی پیدائشی ساخت کے عین مطابق ہے اور قانون اور حقیقت کے درمیان کوئی تضاد پیدا نہیں ہوتا۔

۲۔ مارکس نے انقلاب کا فلسفہ یہ بتایا ہے کہ جس طرح ایک عالم گیر قانون کشش سے ستارے حرکت کر رہے ہیں اسی طرح کچھ ناگزیر تاریخی قوانین ہیں جو سماجی تبدیلیوں کا سبب بنتے ہیں۔ یہ قوانین مسلسل طور پر اپنا کام کر رہے ہیں اور اسی کے مطابق انسانی زندگی میں انقلابات آتے ہیں مگر اس فلسفہ کو مرتب کرنے کے ساتھ ہی اس نے یہ نعرہ بھی لگایا کہ

"دنیا کے مزدورو متحد ہو جاؤ"

ظاہر ہے کہ یہ دونوں باتیں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اگر سماجی تبدیلیوں کا کوئی ناگزیر تاریخی قانون ہے تو سیاسی جدوجہد کی ضرورت نہیں اور اگر سیاسی جدوجہد کے ذریعہ انقلاب آتا ہے تو پھر ناگزیر تاریخی قانون کے کیا معنیٰ۔

اس کے برعکس قرآن انسانی ارادہ کو تسلیم کرتا ہے۔ اس کا فلسفہ یہ ہے کہ زندگی میں جو واقعات پیش آتے ہیں وہ انسان کی اپنی کوششوں کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ مادی دنیا کی طرح ان واقعات کی کوئی لازمی منطق نہیں ہے۔ بلکہ انسانی کوشش انھیں کوئی بھی شکل دے سکتی ہے۔ یقیناً فطرت کے کچھ قوانین ہیں اور اس سلسلہ میں وہ اہم کام کرتے ہیں مگر ان کے کام کی نوعیت یہ ہے کہ وہ انسانی کوششوں کا ساتھ دے کر اسے منزل تک پہونچا دیتے ہیں نہ کہ خود انسانی کوششیں ان قوانین کا خارجی ظہور ہیں۔ اس طرح قرآن کے نظریہ اور اس کی دعوت میں کوئی تضاد نہیں۔ وہ جب اپنے نظریہ کو قائم کرنے کے لئے لوگوں کو پکارتا ہے تو وہ اپنے فلسفہ کی تصدیق کرتا ہے نہ کہ اس کی تردید۔ اس کے برعکس مارکسی فلسفہ اس کے عملی پروگرام سے صاف ٹکرا رہا ہے، کمیونسٹ پارٹیوں کا وجود حقیقی معنوں میں مارکسی فلسفہ کی تردید ہے، کمیونسٹ مینی فسٹو کا آخری فقرہ اس کے پہلے فقرہ کو رد کر دیتا ہے۔

قرآن کی تعلیمات کو اگر آپ انسانی فلسفوں کے مقابلہ میں رکھ کر دیکھیں تو اس قسم کی بہت مثالیں پائیں گے۔

۳۔ قرآن کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ تقریباً ڈیڑھ ہزار برس سے زمین پر موجود ہے۔ اس زمانے میں کتنے انقلابات آئے ہیں، تاریخ میں کتنی الٹ پلٹ ہوئی ہے، زمانہ نے کتنی کروٹیں بدلی ہیں، مگر اب تک اس کی کوئی بات غلط ثابت نہیں ہوئی۔ وہ ہر زمانہ کے عقلی امکانات اور تمدنی ضروریات کا مسلسل ساتھ دیتا چلا جا رہا ہے۔ اس کی تعلیمات کی ہمہ گیری کسی مقام پر بھی ختم نہیں ہوتی بلکہ ہر زمانہ کے مسائل پر حاوی ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہ اس کتاب عظیم کی ایک ایسی خصوصیت ہے جو کسی بھی انسانی کتاب کو اب تک حاصل نہیں ہو سکی ہے۔ انسان کا بنایا ہوا ہر فلسفہ چند ہی دنوں بعد اپنی غلطی ظاہر کر دیتا ہے، مگر صدیوں پر صدیاں گزرتی جا رہی ہیں اور اس کتاب کی صداقت میں کوئی فرق نہیں آتا۔

یہ قانون اس وقت بنایا گیا تھا جب عرب کے غیر متمدن اور منتشر قبائل میں اسلامی ریاست قائم کرنے کا مسئلہ در پیش تھا، مگر اس کے بعد صدیوں تک وہ اسلامی حکومتوں کی تمام ضرورتیں پوری کرتا رہا اور موجودہ ترقی یافتہ دور میں بھی نہ صرف یہ کہ وہ زمانہ کا ساتھ دینے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے بلکہ صرف وہی ایک ایسا نظام ہے جو حقیقی معنوں میں زندگی کے مسائل کو حل کر سکتا ہے۔ ڈیڑھ ہزار برس پہلے جس طرح اس نے اپنی برتری ثابت کی تھی آج بھی وہ اسی طرح تمام فلسفوں پر فوقیت رکھتا ہے۔

یہ قرآن کا معجزہ ہے کہ زندگی کے بارہ میں اس نے جو نظریات پیش کئے تھے اور فرد اور جماعت کے عمل کے لئے جو خاکہ تجویز کیا تھا وہ آج بھی نہ تو پرانا ہوا ہے اور نہ اس میں کسی نقص کی نشاندہی کی جا سکتی ہے۔ اس دوران میں کتنے فلسفے پیدا ہوئے اور مر گئے کتنے نظام بنے اور بگڑ گئے مگر قرآن کے نظریہ کی صداقت اور اس کے عملی نظام کی افادیت آج بھی مسلم ہے۔ وہ ہوا اور پانی کی طرح زمانہ کی قید سے آزاد ہے۔

میں یہاں دونوں پہلوؤں سے ایک ایک مثال پیش کروں گا۔

قرآن نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ کائنات کا محرک ایک ذہن ہے جو بالارادہ اسے حرکت دے رہا ہے۔ قرآن نے یہ دعویٰ یورپ کی نشاۃ ثانیہ سے بہت پہلے کیا تھا۔ اس کے بعد بہت سے فلسفی اور سائنس داں اٹھے جنھوں نے بڑے زور شور کے ساتھ

یہ دعویٰ کیا کہ کائنات محض ایک مادی مشین ہے جو خود بخود حرکت کر رہی ہے۔ یہ نظریہ دوسو برس تک انسانی ذہنوں پر حکومت کرتا رہا۔ ایسا معلوم ہوا کہ علم کی ترقی نے قرآن کے دعویٰ کو رد کر دیا ہے۔ مگر اس کے بعد خود کائنات کے مطالعہ سے سائنس دانوں پر یہ منکشف ہوا کہ زندگی اور کائنات کی توجیہ محض مادی قوانین کے ذریعہ نہیں کی جا سکتی اب سائنس دن بدن قرآن کے اس نظریہ کی طرف لوٹ رہی ہے کہ اس کائنات کے پیچھے ایک ذہن ہے جو اپنے ارادہ سے اس کو چلا رہا ہے۔ مشہور سائنس داں سر جیمز جینز اس تبدیلی کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

علم کے دریا نے پچھلے چند برسوں میں نہایت تیزی سے ایک نیا موڑ اختیار کیا ہے۔ تیس سال پہلے ہمارا خیال تھا یا ہم نے فرض کر لیا تھا کہ ہم ایک ایسی آخری حقیقت کی طرف بڑھ رہے ہیں جو اپنی نوعیت میں مشینی ہے۔ ایسا نظر آتا تھا کہ کائنات ایٹموں کے ایک ایسے بے ترتیب انبار پر مشتمل ہے جو اتفاقی طور پر اکھٹا ہو گئے ہیں اور جن کا کام یہ ہے کہ بے مقصد اور اندھی طاقتوں کے عمل کے تحت جو کوئی شعور نہیں رکھتیں، کچھ زمانے کے لئے ایک بے معنی رقص کریں جس کے ختم ہونے پر محض ایک مردہ کائنات باقی رہ جائے۔ اس خالص مشینی دنیا میں، مذکورہ بالا اندھی طاقتوں کے عمل کے دوران میں، زندگی ایک حادثہ کے طور پر بالکل اتفاق سے آپہونچی ہے۔ کائنات کا ایک بہت ہی چھوٹا گوشہ یا امکان کے طور پر اس طرح کے کئی گوشے کچھ عرصے کے لئے اتفاقی طور پر ذی شعور ہو گئے ہیں۔ مگر موجودہ معلومات کی روشنی میں طبیعیات کی حد تک سائنس کا اب اس بات پر تقریباً اتفاق ہے کہ علم کا دریا ہمیں ایک غیر مشینی حقیقت (Non-Mechanical Reality) کی طرف لے جا رہا ہے۔

اسی مضمون میں آگے چل کر انھوں نے لکھا ہے

جدید معلومات ہم کو مجبور کرتی ہیں کہ ہم اپنے پچھلے خیالات پر نظر ثانی کریں جو ہم نے جلدی میں قائم کر لئے تھے۔ یعنی یہ کہ ہم اتفاق سے ایک ایسی کائنات میں آپڑے ہیں جس کو خود زندگی سے کوئی تعلق نہیں کہ

یادہ باقاعدہ طور پر زندگی سے عداوت رکھتی ہے۔ اب ہم نے دریافت کرلیا ہے
کہ کائنات ایک ایسی خالق یا مدبر طاقت (Designing or Controlling Power)
کا ثبوت فراہم کررہی ہے جو ہمارے شخصی ذہن سے بہت کچھ ملتی جلتی ہے۔"
(ماڈرن سائنٹفک تھاٹ، صفحہ ۱۰۴)

یہ نظری پہلو کی مثال تھی، اب عملی پہلو سے متعلق ایک مثال لیجئے۔ اسلام نے معاشرتی زندگی کا جو قانون بنایا ہے اس میں ایک مرد کو اجازت دی ہے کہ وہ چار عورتوں تک سے شادی کرسکتا ہے۔ اسلام کے بعد جب مغربی تہذیب اٹھی تو اس نے اس قانون کا بہت مذاق اڑایا اور اس کو جاہلیت کے زمانہ کا وحشی قانون قرار دیا۔ اس کے نزدیک یہ قانون عورتوں کے ساتھ سراسر ناانصافی تھی اور اس بنیاد پر کبھی بھی کوئی ترقی یافتہ تمدن تعمیر نہیں کیا جاسکتا تھا۔ چنانچہ مسیحیت میں اگرچہ اس کی گنجائش موجود تھی مگر مغربی تہذیب نے اس کو یک قلم اپنے یہاں سے خارج کردیا اور اس کو ایک نہایت ذلیل فعل قرار دیا کہ کوئی شخص ایک عورت رکھتے ہوئے دوسری عورت سے شادی کرے۔ اس کی تبلیغ اس زور شور سے کی گئی کہ اب یہ حال ہے کہ نہ کوئی مرد اس کی جرأت کرسکتا ہے اور نہ کوئی عورت اپنے بارہ میں ایسا سوچ سکتی ہے کہ وہ کسی شخص کی دوسری یا تیسری بیوی بنے۔

مگر حالات نے ——— اور خاص طور پر دوسری جنگ عظیم کے حالات نے ——— اب یہ ثابت کردیا ہے کہ ایک سے زیادہ شادیوں کی اجازت دراصل زندگی کی ایک عملی ضرورت ہے۔ کبھی بعض افراد کی زندگی میں اور کبھی پوری جماعت کے لئے ایسے غیر معمولی حالات پیدا ہوجاتے ہیں کہ دو میں سے کسی ایک چیز کا انتخاب ناگزیر ہوجاتا ہے۔ یا تو فواحش اور بدکاری کو قبول کیا جائے جس کا مطلب پورے تمدن کو ہولناک خطرہ میں مبتلا کردینا ہے یا تعدد ازدواج کو اختیار کیا جائے جس سے مسئلہ بھی حل ہوجاتا ہے اور کوئی خرابی پیدا نہیں ہوتی۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد ان تمام ملکوں میں جو جنگ میں شریک تھے، یہ صورت حال پیش آئی کہ عورتیں زندہ رہیں اور مرد کثرت سے ہلاک ہوگئے۔ چنانچہ مردوں کی تعداد کم اور عورتوں کی تعداد بہت زیادہ ہوگئی جس کا اثر ابھی تک باقی ہے۔

۱۹۵۵ء کے اعداد و شمار کے مطابق جاپان میں ہر ایک مرد کے مقابلہ میں آٹھ عورتیں تھیں۔ اس جنگ کا سب سے زیادہ اثر جرمنی پر پڑا جہاں بے شمار عورتیں بیوہ اور کتنے بچے یتیم ہو گئے اور لڑکیوں کے لئے شوہر ملنا مشکل ہو گیا۔ اس کی وجہ سے ان ملکوں میں لاوارث اور ناجائز بچوں کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ جو یتیم ہو گئے تھے ان کا کوئی وارث نہیں رہا اور جو عورتیں شوہر سے محروم ہو گئی تھیں انھوں نے فطری تقاضے سے مجبور ہو کر اپنی خواہش پوری کرنے کے لئے ناجائز طریقے اختیار کرنے شروع کر دیئے۔ نوبت یہاں تک پہونچی کہ جرمنی میں بعض عورتوں کے گھروں پر اس قسم کا بورڈ نظر آنے لگا کہ :

(Wanted an Evening Guest)

(رات گزارنے کے لئے ایک مہمان چاہیئے)

دوسری جنگ عظیم میں لڑنے والے ملکوں کے بیشمار مرد مارے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عورتیں شادی شدہ زندگی سے مایوس ہو کر طوائف کی زندگی گزارنے لگیں۔ جیمز کیمرون (James Cameron) دوسری جنگ عظیم میں جرمنی میں نامہ نگار تھے۔ اس سلسلے میں انھوں نے اپنی یادداشت شائع کی ہے۔ یہ برطانی نامہ نگار اس میں لکھتا ہے کہ جنگ کے خاتمہ پر جب میں برلن گیا تو شکست خوردہ شہر بنیادی طور پر بھوکی طوائفوں (Hungry Whores) سے بھرا ہوا تھا۔ میں نے اس کو اپنے ذہن سے نکالنا چاہا مگر میں نہ نکال سکا۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں۔

It is not so much that I have no stomach for the fight, I had no stomach for the victory.

ایسا نہ تھا کہ جنگ کی برداشت کی طاقت مجھ میں نہ ہو۔ مگر فتح کو برداشت کرنے کی طاقت مجھ میں نہیں تھی (گارجین ۱۰ اکتوبر ۱۹۸۲ء)

اگرچہ مغربی ذہن نے ابھی تک اس معاملہ میں اپنی غلطی تسلیم نہیں کی ہے مگر واقعات نے صریح طور پر اس کا غلط ہونا ثابت کر دیا ہے اور وہ دن دور نہیں جب زبان سے بھی اس کو تسلیم کر لیا جائے گا۔ اس وقت معلوم ہوگا کہ نکاح کے معاملہ میں جس اصول کو مغرب نے اختیار کیا تھا اس کا مطلب یہ ہے کہ سماج کو فحاشی میں مبتلا کر کے بے شمار جرائم کا دروازہ کھول دیا جائے۔ جب کہ اسلام کا اصول اصل مسئلہ کو بہترین طریقہ پر حل کرتا ہے اور سماج کو بہت شدید نقصانات سے بچا لیتا ہے۔

قرآن کے نظریات اور اس کے قوانین کی ابدیت کی یہ دو مثالیں تھیں جن سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ انسانی ساخت کے نظریے اور قوانین بن بن کر بگڑتے رہے مگر قرآن نے پہلے دن جو کچھ کہا تھا آخر دن تک اس کی سچائی میں کوئی فرق نہیں آیا وہ پہلے جس طرح حق تھا آج بھی اسی طرح حق ہے۔ قرآن کی یہ خصوصیت ظاہر کرتی ہے کہ وہ ایک ایسے ذہن سے نکلا ہے جس کا علم ماضی اور مستقبل پر محیط ہے۔ قرآن کی ابدیت قرآن کے کلام الٰہی ہونے کا کھلا ہوا ثبوت ہے۔

آخری بات

ہمارے مطالعہ نے اب ہمارے لئے حقیقت کے دروازے کھول دیئے ہیں۔ ہم نے اپنے سفر کا آغاز اس سوال سے کیا تھا کہ "ہم کیا ہیں اور یہ کائنات کیا ہے" اس کا جواب بہت سے لوگوں نے اپنے ذہن سے دینے کی کوشش کی ہے، مگر ہم نے دیکھا کہ یہ جوابات حقیقت کی صحیح تشریح نہیں کرتے۔ پھر ہمارے کانوں میں عرب سے نکلی ہوئی ایک آواز آئی۔ ہم نے اس پر غور کیا، اس کو کائنات کے فریم میں رکھ کر دیکھا، انسانی تاریخ میں اسے آزمایا اور فطرت کی گہرائیوں میں اتر کر اس کو پہچاننے کی کوشش کی۔ ہم نے دیکھا کہ کائنات، تاریخ اور انسانی نفسیات متفقہ طور پر اس کی تصدیق کر رہے ہیں، ہمارا تمام علم اور ہمارے بہترین احساسات بالکل اس کی تائید میں ہیں۔ جس حقیقت کی ہمیں تلاش تھی اس کو ہم نے پالیا۔ اب ہمیں یہ فیصلہ کرنا ہے کہ ہم اس کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔

انسان کا المیہ

ڈاکٹر اتم پرکاش (۱۹۸۲ - ۱۹۲۸) ہندستان کے ایک نامور سرجن تھے۔ وہ آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز میں شعبہ سرجری کے ہیڈ تھے۔ ڈاکٹر پرکاش کو پدم بھوشن کا انعام ملا تھا۔ سرجری کی عالمی کانگرس ۷ فروری کو دہلی میں ہونے والی تھی جس کی صدارت کی کرسی ان کا انتظار کر رہی تھی۔ مگر ۱۴ فروری کو ان پر دل کا دورہ پڑا اور اسپتال پہنچتے پہنچتے ان کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت ان کی عمر صرف ۵۴ سال تھی۔

سرجری پر ہونے والی ورلڈ کانگرس کی کامیابی ان کے ذاتی وقار کو بہت زیادہ بڑھا دیتی۔ اس بنا پر وہ اس کے معاملات میں غیر معمولی دلچسپی لے رہے تھے۔ انھوں نے راشٹرپتی سنجیوا ریڈی کو آمادہ کر لیا تھا کہ وہ کانگرس کا افتتاح کریں۔ مگر جب سارے انتظامات مکمل ہو چکے تو راشٹرپتی بھون سکریٹریٹ سے بتایا گیا کہ راشٹرپتی ان کے اجلاس میں صرف اس وقت شرکت کر سکیں گے جب کہ مرکزی وزیر صحت بھی وہاں موجود ہوں۔ پروٹوکول (آداب شاہی) کے مطابق ایسا ہونا ضروری ہے۔

اس سے پہلے ڈاکٹر پرکاش کے منصوبہ میں وزیر صحت کو بلانا شامل نہ تھا۔ مگر اب ضروری ہو گیا کہ وزیر صحت کو بھی شرکت اجلاس کی دعوت دی جائے۔ ڈاکٹر پرکاش نے وزیر صحت کے دفتر کا طواف شروع کیا۔ مگر اب یہاں دوسری رکاوٹ حائل تھی۔ وزیر صحت اجلاس میں شرکت پر راضی نہ ہو سکے۔ ایک ایسے اجلاس میں شرکت کرنا ان کی عزت نفس کے خلاف تھا جس کے اولین پروگرام میں ان کو شامل نہ کیا گیا ہو۔ یہ صدمات ڈاکٹر اتم پرکاش کے لئے اتنے سخت ثابت ہوئے کہ اجلاس کے تین دن پہلے ان پر دل کا سخت دورہ پڑا اور اسی میں ان کا انتقال ہو گیا۔ کوئی شخص اپنے وقت سے پہلے نہیں مرتا۔ مگر ایک اخباری مبصر (ہندستان ٹائمس ۱۶ فروری ۱۹۸۲) کے یہ الفاظ بالکل درست ہیں کہ موت کے طویل سفر پر روانہ ہونے سے پہلے وہ دہلی کے سب سے زیادہ پریشان آدمی تھے:

He was the most worried man in town before he took the long road

آج آدمی وقار کے کھونے کو بھی برداشت نہیں کر پاتا۔ پھر آنے والی دنیا میں آدمی کا کیا حال ہوگا۔ جب اس کو بھوک اور پیاس لگے گی مگر وہاں کھانا نہ ہوگا جس کو وہ کھائے اور پانی نہ ہوگا جس سے وہ اپنی پیاس بجھائے۔ وہ تیز دھوپ میں جل رہا ہوگا مگر اس کے لئے کوئی سایہ نہ ہوگا جس کے نیچے وہ پناہ لے۔ عذاب اس کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہوگا مگر وہاں کوئی مددگار نہ ہوگا جو اس کی مدد کو پہنچے۔ آہ وہ انسان جو کنکری کی چوٹ کو برداشت نہیں کر پاتا حالانکہ اس کے اوپر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ کر گرنے والا ہے۔

داعی اور مدعو

سڑک پر ہر وقت آدمی چلتے رہتے ہیں۔ مگر آنے جانے والوں میں کبھی "ملاقات" نہیں ہوتی۔ کیونکہ ایک دائیں سے نکل جاتا ہے اور دوسرا بائیں سے۔ جب کہ ملاقات کے لئے ضروری ہے کہ دونوں آدمی ایک رخ پر چل رہے ہوں۔

"دائیں بائیں" کا اصول سڑک کے لئے بہت کارآمد ہے مگر وہ ہر موقع کے لئے کارآمد نہیں۔ زندگی کے ایسے راستے بھی ہیں جہاں ملاپ درکار ہے نہ کہ ادھر اُدھر سے کترا کر نکل جانا۔ ان راستوں میں آپ کو بھی اسی رخ پر چلنا پڑے گا جس رخ پر دوسرا چل رہا ہے۔ ورنہ آپ ان راستوں میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔

دعوت کا راستہ ایسا ہی ایک راستہ ہے۔ یہاں اعراض کے بجائے ملاقات کا اصول اختیار کرنا پڑتا ہے۔ ورنہ داعی اور مدعو کا سامنا ہی نہ ہوگا اور جب سامنا نہ ہوگا تو دعوت کس طرح پیش کی جائے گی اور وہ کس کے کان میں پڑے گی۔

مدعو اگر انگریزی زبان بولنے والا ہے تو آپ ہندی زبان بول کر اس کو اپنی دعوت سے باخبر نہیں کر سکتے۔ ضروری ہے کہ داعی بھی وہی زبان بولے جو مدعو کی زبان ہے۔ مدعو اگر ایک قومیت کا ہنگامہ کھڑا کئے ہوئے ہے تو آپ دوسری قومیت کا ہنگامہ کھڑا کر کے اس کو اپنے پیغام سے قریب نہیں کر سکتے۔ اس کے بجائے آپ کو یہ کرنا ہوگا کہ قومیت سے بلند ہو کر ایسی اجتماعی اساس تلاش کریں جو دونوں کے درمیان مشترک ہو۔ مدعو اگر آپ سے روٹھ کر اپنا منھ پھیرے ہوئے ہے تو آپ ایسا نہیں کر سکتے کہ اپنا منھ بھی دوسری طرف پھیر لیں۔ اس کے بجائے آپ کو یک طرفہ طور پر شکایات کو ختم کرنا ہوگا تاکہ دونوں کے درمیان وہ معتدل فضا پیدا ہو جو کسی سنجیدہ پیغام کو سنانے کے لئے ضروری ہے۔

قومی مسلک میں جو چیز امرت ہے وہ دعوتی مسلک میں زہر ہے۔ مفاد پرستانہ سیاست میں جو اصول زندگی کا پہلا گر ہے وہ دعوت حق کی سیاست میں صرف اس قابل ہے کہ اس کو مکمل طور پر ترک کر دیا جائے۔ شخصی قیادت کے کاروبار میں جو چیز کامیابی کا زینہ ہے وہ دعوت کے عمل میں صرف ناکامی تک پہنچانے والا ہے۔ ایک طریقہ کو دوسرے طریقہ سے کوئی مناسبت نہیں ہے۔

داعی ہمیشہ مدعو کی رعایت کرتا ہے اور غیر داعی صرف اپنی رعایت کرنا جانتا ہے۔ داعی کو حق کا جھنڈا کھڑا کرنے کی فکر ہوتی ہے اور غیر داعی کو صرف اپنا جھنڈا کھڑا کرنے کی۔ داعی مدعو کا خیر خواہ ہوتا ہے اور غیر داعی صرف اپنا۔

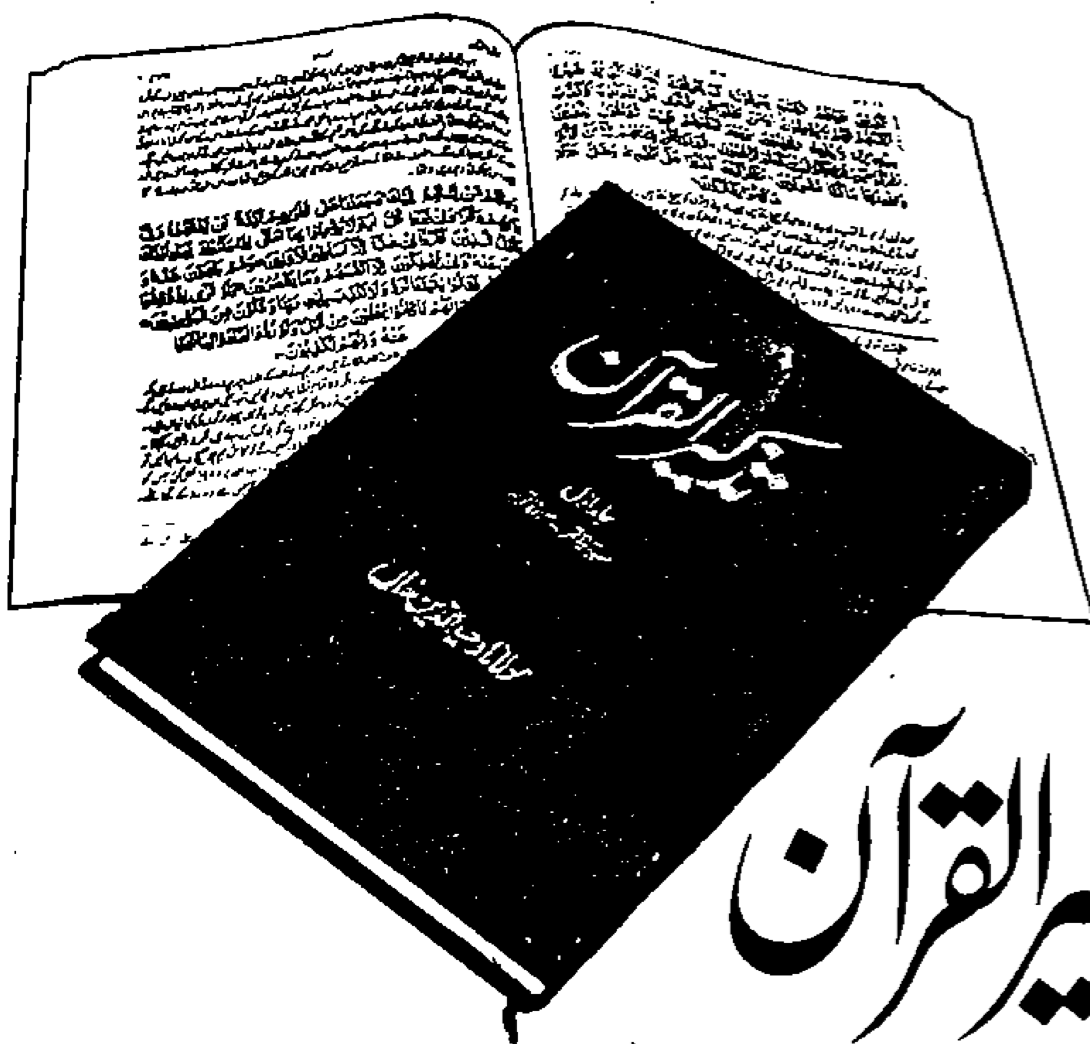

ایجنسی: ایک تعمیری اور دعوتی پروگرام

الرسالہ عام معنوں میں صرف ایک پرچہ نہیں، وہ تعمیر ملت اور احیاء اسلام کی ایک مہم ہے جو آپ کو آواز دیتی ہے کہ آپ اس کے ساتھ تعاون فرمائیں۔ اس مہم کے ساتھ تعاون کی سب سے آسان اور بے ضرر صورت یہ ہے کہ آپ الرسالہ کی ایجنسی قبول فرمائیں۔

"ایجنسی" اپنے عام استعمال کی وجہ سے کاروباری لوگوں کی دلچسپی کی چیز سمجھی جانے لگی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ایجنسی کا طریقہ دور جدید کا ایک مفید عطیہ ہے جس کو کسی فکر کی اشاعت کے لئے کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جاسکتا ہے۔ کسی فکری مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنے کی یہ ایک انتہائی ممکن صورت ہے اور اسی کے ساتھ اس فکر کو پھیلانے میں اپنا حصہ ادا کرنے کی ایک بے ضرر تدبیر بھی۔

تجربہ یہ ہے کہ بیک وقت سال بھر کا زر تعاون روانہ کرنا لوگوں کے لئے مشکل ہوتا ہے۔ مگر پرچہ سامنے موجود ہو تو ہر مہینے ایک پرچہ کی قیمت دے کر وہ بآسانی اس کو خرید لیتے ہیں۔ ایجنسی کا طریقہ اسی امکان کو استعمال کرنے کی ایک کامیاب تدبیر ہے۔ الرسالہ کی تعمیری اور اصلاحی آواز کو پھیلانے کی بہترین صورت یہ ہے کہ جگہ جگہ اس کی ایجنسی قائم کی جائے۔ بلکہ ہمارا ہر ہمدرد اور متفق اس کی ایجنسی لے۔ یہ ایجنسی گویا الرسالہ کو اس کے متوقع خریداروں تک پہنچانے کا ایک کارگر درمیانی وسیلہ ہے۔

وقتی جوش کے تحت لوگ ایک "بڑی قربانی" دینے کے لئے بآسانی تیار ہو جاتے ہیں۔ مگر حقیقی کامیابی کا راز ان چھوٹی چھوٹی قربانیوں میں ہے جو سنجیدہ فیصلہ کے تحت لگاتار دی جائیں۔ ایجنسی کا طریقہ اس پہلو سے بھی اہم ہے یہ ملت کے افراد کو اس کی مشق کراتا ہے کہ ملت کے افراد چھوٹے چھوٹے کاموں کو کام سمجھنے لگیں۔ ان کے اندر یہ حوصلہ پیدا ہو کہ وہ مسلسل عمل کے ذریعہ نتیجہ حاصل کرنا چاہیں نہ کہ یکبارگی اقدام سے۔

ایجنسی کی صورتیں

پہلی صورت ——— الرسالہ کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔ مطلوبہ پرچے کمیشن وضع کرکے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔ اس اسکیم کے تحت ہر شخص ایجنسی لے سکتا ہے۔ اگر اس کے پاس کچھ پرچے فروخت ہونے سے رہ گئے ہیں تو اس کو پوری قیمت کے ساتھ واپس لے لیا جائے گا۔ بشرطیکہ پرچے خراب نہ ہوئے ہوں۔

دوسری صورت ——— الرسالہ کے پانچ پرچوں کی قیمت بعد وضع کمیشن ۱۱ روپیہ ۲۵ پیسے ہوتی ہے۔ جو لوگ صاحب استطاعت ہیں وہ اسلامی خدمت کے جذبہ کے تحت اپنی ذمہ داری پر پانچ پرچوں کی ایجنسی قبول فرمائیں۔ خریدار ملیں یا نہ ملیں، ہر حال میں پانچ پرچے منگوا کر ہر ماہ لوگوں کے درمیان تقسیم کریں۔ اور اس کی قیمت خواہ سالانہ ۱۳۵ روپے یا ماہانہ ۱۱ روپیہ ۲۵ پیسے دفتر الرسالہ کو روانہ فرمائیں۔

ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی سے شائع کیا

Regd. R.N. No. 28822/76
Regd. D(DN) No. 532

February 1983
Issue No. 75

AL-RISALA MONTHLY

Jamiat Building, Qasimjan Street, Delhi - 110 006 (India)

Telephone : 232231, 526851

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

۱۔	تذکیر القرآن	۵۰--۰
۲۔	الاسلام	۱۵—۰
۳۔	مذہب اور جدید چیلنج	۱۵—۰
۴۔	ظہورِ اسلام	۱۵—۰
۵۔	دین کیا ہے؟	۲—۰
۶۔	قرآن کا مطلوب انسان	۵—۰
۷۔	تجدیدِ دین	۳—۰
۸۔	اسلام دینِ فطرت	۳—۰
۹۔	تعمیرِ ملت	۳—۰
۱۰۔	تاریخ کا سبق	۳—۰
۱۱۔	مذہب اور سائنس	۵—۰
۱۲۔	عقلیاتِ اسلام	۳—۰
۱۳۔	فسادات کا مسئلہ	۲—۰
۱۴۔	انسان اپنے آپ کو پہچان	۱—۰
۱۵۔	تعارفِ اسلام	۲—۵۰
۱۶۔	اسلام پندرھویں صدی میں	۲—۰
۱۷۔	راہیں بند نہیں	۳—۰
۱۸۔	دینی تعلیم	۳—۰
۱۹۔	ایمانی طاقت	۳—۰
۲۰۔	اتحادِ ملت	۳—۰
۲۱۔	سبق آموز واقعات	۳—۰
۲۲۔	اسلامی دعوت	۳—۰
۲۳۔	زلزلۂ قیامت	۴—۰
۲۴۔	سچا راستہ	۱—۰
۲۵۔	نارِ جہنم	۳—۰
۲۶۔	باغِ جنت	۳—۰

مکتبہ الرسالہ - دہلی ۶